ماہنامہ

# الریاض

سلسلہ عالیہ سراجیہ حقانیہ

جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ / جولائی ۲۰۰۶ء شمارہ (۲)

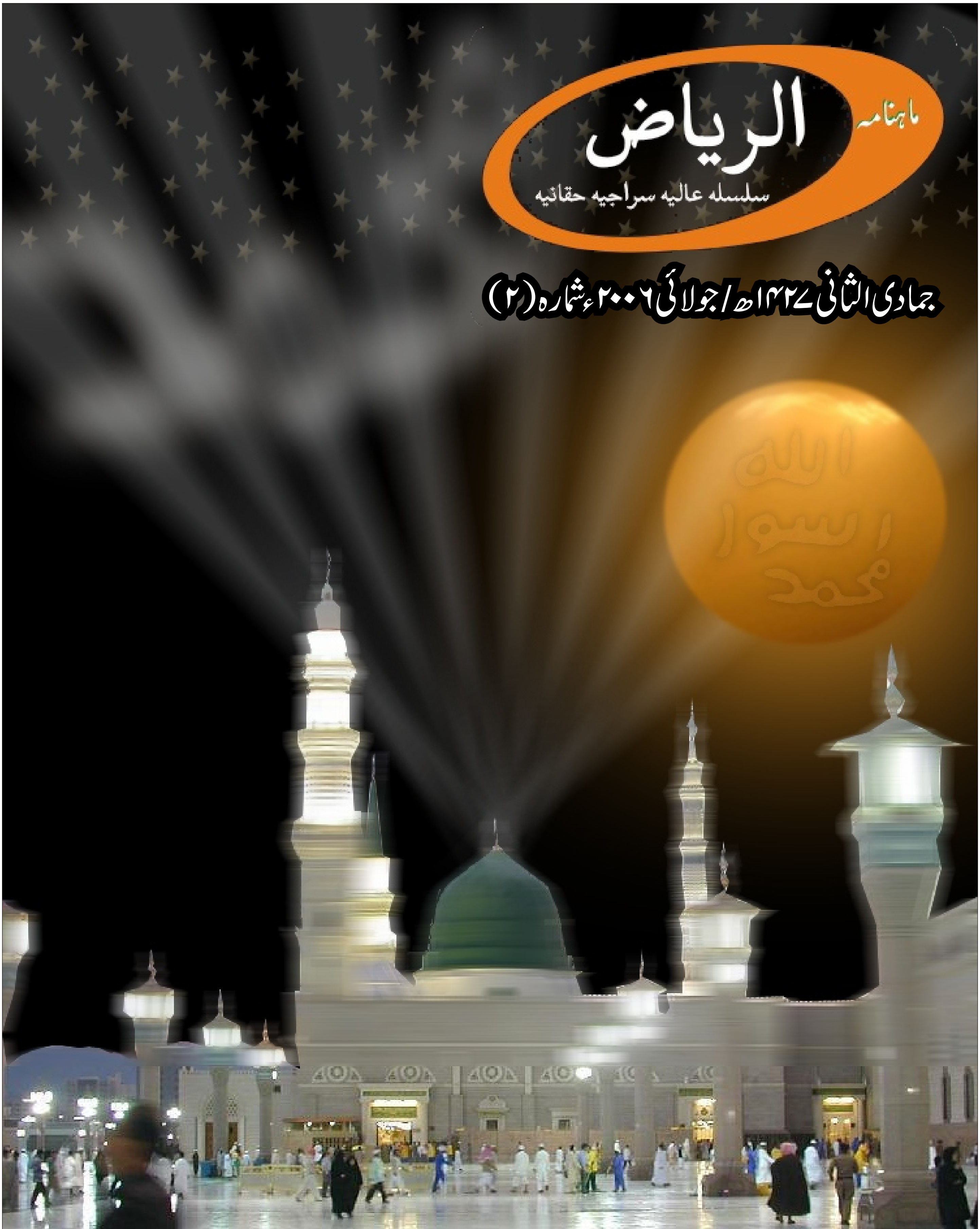

فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ حبیبِ کفن ہنوز

ماہنامہ **الریاض**

جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ / جولائی ۲۰۰۶ء شمارہ (۲)

# سلسلہ عالیہ سراجیہ حقانیہ

ویب سائٹ: www.haqqaniya.org

ای میل: info@haqqaniya.org

## فہرست

| | | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| **حمد باری تعالیٰ** | کلام: خواجہ غلام قطب الدّین فریدی دامت برکاتہم العالیہ۔ | ۱ |
| **نعت** | کلام: صاحبزادہ محمد ظفر الحق چشتی دامت برکاتہم العالیہ۔ | ۲ |
| **شہیدِ ناموسِ رسالت مآب** | کلام: صاحبزادہ محمد ظفر الحق چشتی دامت برکاتہم العالیہ۔ | ۳ |
| **خرقہ پوشی** | تحریر: شیخ شہاب الدین سہروردیؒ۔ | ۷ |
| **تصوف اور اسلام** | تحریر: حضرت واحد بخش سیال چشتی صابریؒ۔ | ۱۷ |
| **انعامِ شکست** | تحریر: علامہ ارشد القادریؒ۔ | ۲۷ |
| **حدیثِ دل** | ۔ | ۔ |

## اراکین

محمد ندیم کھوکھر سراجی حقانی

علی سلطان قریشی سراجی حقانی

غلام مرتضیٰ سراجی حقانی

محمد عمران سراجی حقانی

فہد حمید

محمد رضوان عالم قادری — گرافکس ڈیزائنر، کمپوزر

# حمد باری تعالیٰ

پروردگارِ خَلق سمیع و بصیر ہے
آگاہِ حال ہے کہ علیم و خبیر ہے

عالم تمام اس کے کرم سے ہیں فیضیاب
ہر اک سے بے نیاز اسی کا فقیر ہے

اس کو شعور و فکر میں لائے کسے مجال
اس کی کوئی مثال نہ کوئی نظیر ہے

ایجاد کائنات ہوئی اس کے حکم سے
قادر ہر ایک شے پہ ہو ربِّ قدیر ہے

اس کے بغیر کس کو زمانے میں ہے ثبات
گردش میں کائنات ہے، مہرِ منیر ہے

ہر رنج و غم سے اس کو رہائی ہوئی نصیب
ذکرِ خدائے پاک میں جو دل اسیر ہے

گھبرائے قطبؔ گردشِ دوراں سے کس لئے
حلّالِ مشکلات جو اس کا نصیر ہے

کلام: خواجہ غلام قطب الدّین فریدی دامت برکاتہم العالیہ

# نعت

چونکہ سرکارؐ کی دہلیز پر سَر میرا ہے
اِس لیے آج سرِ عرش گزر میرا ہے

ہمسفر میرے ہیں سلمانؓ و بِلالؓ و رومیؒ
اُلفتِ آلِ نبیؐ رَختِ سفر میرا ہے

قطرۂ خونِ جِگر نوکِ مژہ سے ٹپکے
کاوشِ نعتِ نبیؐ میں یہ ہُنر میرا ہے

آمد و رفت یہاں رہتی ہے اہلِ دِل کی
اُنؐ کے اَنوار سے آباد یہ گھر میرا ہے

جلوۂ گنبدِ خَضریٰ ہے میری آنکھوں میں
عشقِ محبوبِ خدا میں یہ ثمر میرا ہے

رَحمتِ حق بھی لگی میری بلائیں لینے
جِس گھڑی آپؐ نے فرمایا ظفرؔ میرا ہے

کلام: صاحبزادہ محمد ظفر الحق چشتی دامت برکاتہم العالیہ

# پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

## (شہیدِ ناموس رسالت مآبؐ)

بات کہاں سے شروع کروں، بات شہیدِ ناموسِ رسالت مآبؐ کی ہے۔ قلم بے بس ہے، زبان گنگ ہے، الفاظ بے مایہ ہیں، خواجۂ یثرب صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم کی عزت پر مر مٹنے والے شہید کا قصیدہ لکھا جا سکتا ہے، اُس کی عظمتوں کی بات ہو سکتی ہے لیکن یہ تب ممکن ہے جب خدا نفسِ جبرائیلؑ عطا کر دے۔

عامر شہید نے جو کارِ عشق کر دکھایا ہے یہ اُسی کا حصہ ہے۔ وہ غازی علم دین شہید کا جانشین ہے۔ اُس کی جرأتوں پر اہلِ دانش دنگ ہیں، عقل حیرت سے تک رہی ہے۔ عقل تو اُس وقت بھی محوِ تماشائے لبِ بام تھی جب عشق بے خوف و خطر آتشِ نمرود میں کود رہا تھا۔ عامر شہید نے جو کر دکھایا ہے اُس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ عامر شہید اَن پڑھ نہیں تھا، جاہل نہیں تھا، کسی مذہبی مدرسے کا فارغ التحصیل نہیں تھا اور نہ ہی وہ ابلہِ مسجد تھا۔ وہ ایک اعلیٰ اور جدید تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ اُسے جرمن یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملنے والی تھی۔ اُس نے سائنس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن وہ مسلمان تھا، ایک غیرت مند مسلمان، اُس کی حمیّت زندہ تھی۔ وہ تہذیب کا فرزند نہیں تھا۔ اُس کے خون میں عشقِ رسالت مآبؐ کی تپش تھی۔ وہ اقبالؔ کا شاہین تھا، وہ اقبالؔ کا مردِ مومن تھا۔ اُس کے بدن میں روحِ محمدؐ رواں دواں تھی اور یہ روحِ محمدؐ اہلِ یورپ اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی فاقہ کش مسلمان کے بدن سے نکال نہیں سکے۔

عامر شہید جرمنی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ نہ وطن اپنا، نہ لوگ اپنے، نہ زبان اپنی، نہ معاشرت اپنی، نہ مذہب اپنا، نہ حکومت اپنی۔ وہ یہود و نصاریٰ کے حصار میں تھا اور وہ جو کچھ کرنے جا رہا تھا اُس کا انجام اور مآل اُس پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھا لیکن وہ اس انجام سے بے پروا تھا۔ اُس کے سامنے وہ مآل تھا جو حضرت عمیر بن عدیؓ، حضرت سالم بن عمیرؓ، حضرت محمد بن مسلمہؓ، حضرت محیصہ بن مسعودؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت عبداللّٰہ بن عتیکؓ، حضرت ابو برزہ اسلمیؓ، حضرت سعد بن حریثؓ، حضرت علی ابنِ ابو طالبؓ اور حضرت غازی علم دین شہیدؒ کو حاصل ہو چکا تھا۔ یہ سب وہ عاشقانِ رسولؐ ہیں جنھوں نے توہینِ رسالت مآب کا ارتکاب کرنے والے یہود و نصاریٰ اور مشرکین کو جہنم واصل کیا تھا۔ لیکن یہ سب علم دین شہیدؒ کے علاوہ اپنے معرکوں میں غازی رہے۔ علم دینؒ اور عامر کو شہادت بھی نصیب ہوئی۔ شرارِ بولہبی چراغِ مصطفوی سے ہمیشہ ستیزہ کار رہا ہے لیکن چراغِ مصطفویؐ کے پروانے اپنی جانیں قربان کر کے اس چراغ کی حفاظت کرتے رہیں گے۔ عامر شہید بھی شمعِ رسالت مآبؐ کا پروانہ تھا۔ وہ بالکل خوفزدہ نہیں تھا۔ اُس نے توہینِ رسالت مآب کا ارتکاب کرنے والے صحافیوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا اور پھر اُس نے ایک ایسے ہی بداصل جرمن صحافی پر وَار کر دیا۔ اُس بدبخت کا بچ نکلنا مشیّتِ الٰہی ہے، یہ ایک الگ معاملہ ہے۔ بہر حال عامر شہید نے جو کچھ کیا باہوش و حواس کیا،

انجام اُس کے سامنے تھا۔ وہ موت سے ڈرنے والا نہیں تھا۔ اُس کا ایمان کامل تھا۔ وہ تو اُن مردوں میں سے تھا جو موت کی آمد پر مسکراتے ہیں۔

جرمن پولیس نے عامر شہید کو گرفتار کر لیا اور پھر مہذّب ملک و قوم کی مہذب پولیس نے دورانِ تفتیش جیل میں تشدد کر کر کے اس عاشقِ رسولؐ کو شہید کر دیا اور پھر ابلیس کے ان کارندوں نے یہ اعلان کر دیا کہ عامر شہید نے جیل میں خود کشی کر لی ہے۔ تف ہے اُن پاکستانی عقل کے اندھے دانشوروں پر، ضمیر فروشوں پر اور بے غیرتوں پر جو اپنے یورپی آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر عامر شہید کی شہادت کو خود کشی قرار دیتے ہیں۔ ہمارے "روشن خیال" معاشرے میں ایسے بہت سے "بیکار جرنی" موجود ہیں جو اپنے یورپی آقاؤں سے اسلام دشمنی اور پاکستان دشمنی کے عوض وظیفے پاتے ہیں اور آدمیت اور خدمتِ آدمیت کا ڈھونگ رچاتے ہیں، لہو پیتے ہیں اور تعلیمِ مساوات دیتے ہیں۔

۱۳ فروری کو عامر شہید کی نمازِ جنازہ تھی۔ اس سِلسلے میں ہمارا ٹیلی ویژن اور اخبارات کئی دنوں سے متضاد اطلاعیں فراہم کر رہے تھے۔ خبر نہیں اِس میں کیا راز تھا اور یہ سب کچھ کِس طاقت کی خوشنودی کی خاطر ہو رہا تھا۔ آخری خبر یہ تھی کہ ۱۴ فروری کو شہید کا جسدِ اطہر لاہور لایا جائے گا اور لاہور میں نمازِ جنازہ ہو گی۔ ایک خبر یہ بھی تھی کہ شہید کے لواحقین راولپنڈی اسلام آباد میں نمازِ جنازہ کی خواہش رکھتے تھے۔ یہ بھی ایک راز ہے کہ شہید کے والدِ گرامی پروفیسر نذیر کی اس سلسلے میں کیا خواہش تھی اور اُن کی خواہش کا کیا احترام کیا گیا۔ بہر حال پھر ۱۲ فروری کو رات گئے یہ خبر آئی کہ شہید کی نمازِ جنازہ ۱۳ فروری کو اُن کے آبائی گاؤں "ساروکی" تحصیل وزیر آباد میں ہو گی۔ یہ بڑی اچانک خبر تھی اور اس اچانک خبر کے بارے میں بھی بڑے تضاد سامنے آ رہے تھے۔ ایک اخبار نے نمازِ جنازہ کا وقت ۱۱ بجے صبح بتایا، دوسرے اخبار نے ۳ بجے سہ پہر بتایا اور ٹیلی ویژن نے ۴ بجے شام کی خبر دی۔ یہ سب کچھ کس لیے کیا گیا اور کس کے ایما پر کیا گیا، یہ ایک سوال ہے جو ہر ذہن میں کروٹیں لے رہا ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا اس کے باوجود شہید کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔

مجھ بے مایہ کو بھی شہید کے جنازے میں شرکت کا شرف حاصل ہوا۔ میں ۱۱ بجے صبح "ساروکی" پہنچ گیا۔ میں اس سلسلے میں پروفیسر طارق چودھری کا ممنونِ احسان ہوں جو مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر "ساروکی" لے گئے۔ "ساروکی" وزیر آباد تحصیل کا ایک قصبہ ہے۔ "ساروکی" کو کون جانتا تھا؟ لیکن یہ عامر شہید کے خون کا معجزہ ہے کہ آج چار دانگِ عالم میں "ساروکی" کا چرچا ہے۔ شہید کی موت قوم کی حیات ہوتی ہے۔ "ساروکی" کا نام ابدا لآباد تک زندہ ہو گیا ہے۔ "ساروکی" چوک سے عامر شہید کے گھر کا راستہ تقریباً ۳ کلو میٹر ہو گا۔ سارا راستہ جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ دُور دُور تک مخلوقِ خدا دکھائی دے رہی تھی۔ شدید ترین گرمی کے باوجود لاکھوں افراد "ساروکی" پہنچ چکے تھے۔ "ساروکی" کے رہائشی باشندوں کی محبت قابلِ تحسین تھی۔ ہر گھر کے دروازے شہید کے سوگواروں کے لیے کھلے تھے اور ہر گھر کے آگے ٹھنڈے پانی کی سبیل لگی ہوئی تھی۔ اخوت و محبت اور عقیدت و احترام کا یہ منظر دیدنی تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب عامر شہید کا جسدِ اطہر "ساروکی" لایا گیا۔ مخلوقِ خدا نے پھول نچھاور کیے۔ دیکھنے والی آنکھوں نے دیکھا کہ فرشتے اور حُوریں بھی عامر شہید پر باغِ جنت کے پھول نچھاور کر رہے تھے۔ شہید کے جنازے کے بانکپن پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ بار بار غالبؔ میرے کان میں کہہ رہے تھے:

اِک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

میں سوچتا ہوں کہ عامر شہید کا جنازہ بادشاہی مسجد اور اقبال پارک لاہور میں ہونا چاہیے تھا لیکن مشیّتِ ایزدی نے یہ اعزاز "ساروکی" کی سرزمین کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔ عامر شہید کی نمازِ جنازہ ایک بجے دوپہر پڑھائی گئی۔ چند ایک مذہبی اور سیاسی مفاد پرست وہاں پر بھی موجود تھے، "فی سبیل اللّٰہ فساد" والے مُلا بھی تھے جو نمازِ جنازہ کے سلسلے میں اختلاف پیدا کرنا چاہتے تھے لیکن عامر شہید کے والدِ گرامی پروفیسر نذیر نے خود نمازِ جنازہ پڑھا کر اس سازش کا اور فتنے کا سر کچل دیا۔ عامر شہید کے جنازے میں شرکت کرنے والوں کی تعداد کے بارے میں بھی ہمارے اخبارات اور ٹیلی وژن متضاد خبریں دے رہے ہیں۔ ٹیلی ویژن نے چالیس ہزار تعداد بتائی حالانکہ گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی تعداد بھی اس سے زیادہ تھی۔ وہاں پر موجود افراد کے اندازے بلکہ محتاط اندازے کے مطابق شہید کے جنازے میں چار پانچ لاکھ افراد شامل تھے۔

عامر شہید کے جنازے کے موقع پر محمد مصطفیٰ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کے نام لیواؤں کے جذبات دیدنی تھے۔ چہروں پر خوشی بھی تھی، حسرت بھی تھی، دلوں میں کرب بھی تھا اور زبانوں پر داد و تحسین بھی تھی۔ تابوت کو بوسے دیے جا رہے تھے۔ اُس خوش قسمت ایمبولینس کو بھی چوما جا رہا تھا جس میں شہید کا تابوت رکھا تھا۔ بعض لوگ عامر شہید کی لحد کی مٹی چہروں اور سروں پر مل رہے تھے۔ کسی کی آنکھ میں آنسو تھے، کسی کے لب پر درود و سلام کے نغمے تھے، کوئی کلمہ طیّبہ کا وِرد کر رہا تھا، کوئی سبحان اللّٰہ پکار رہا تھا، کہیں نعرہ ہائے تکبیر و رسالت کی صدائیں تھیں اور "ساروکی" کے ذرّے ذرّے سے یہ آواز آرہی تھی:

بتلا دو گستاخِ نبی کو غیرتِ مُسلم زندہ ہے
اُنؐ پر مَر مِٹنے کا جذبہ کل بھی تھا اور آج بھی ہے

عامر شہید کا جنازہ بڑا شاندار تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے، امیر غریب، خواتین و حضرات، شیعہ سنی، وہابی، دیوبندی، بریلوی، اہلِ حدیث، جن و ملک سب ہی شریک تھے۔ بس اس ملک کے حُکمران شامل

نہیں تھے۔ جو ملک محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نامِ نامی پر حاصل کیا گیا تھا، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ عامر شہید کے جنازے میں جنت کے حکمران شامل تھے، انبیاءؑ تھے، رُسُلؑ تھے، پیغمبرؑ تھے، صدیقینؒ تھے، شہداءؒ تھے، صالحینؒ تھے، اولیاءؒ تھے۔ جو تھے وہ بامراد تھے، جو نہیں تھے وہ بے مراد تھے۔ ابلیس کے یورپی کارندے اور یورپی آقاؤں کے دیسی غلام یہ جان لیں کہ شمعِ ناموسِ رسالت مآبؐ کے پروانے اس گئے گزرے دور میں بھی جاں نثاری کا جذبہ دِلوں میں رکھتے ہیں اور عامر شہید کا جذبۂ ایمانی، شوقِ شہادت اور عشقِ رسالت مآبؐ لحد میں بھی زندہ ہے اور اُس کی لحد سے مسلسل یہ آواز آرہی ہے:

فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر
ہے داغِ عشق زینتِ حبیبِ کفن ہنوز

عظیم ہے وہ ماں جس نے عامر شہید کو جنم دیا۔ مقدس ہے وہ سر زمین جہاں پر عامر شہید نے پرورش پائی۔ "ساروکی" زندہ باد، "ساروکی" تیری مٹی کا ذرّہ ذرّہ مسجودِ مہر و ماہ ہے۔ تیری آغوش میں شہیدِ ناموسِ رسالت مآبؐ کی لحد ہے۔ تو رشکِ جنت ہے، تیرا اِترانا، تیرا ناز کرنا، تیرا فخر کرنا تجھے زیب دیتا ہے کیونکہ شہید کی لحد پر سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سواری توضرور اُتری ہو گی۔

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اِترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگزار کی

تحریر: صاحبزادہ محمد ظفر الحق چشتی دامت برکاتہم العالیہ

## حدیثِ دل

تصوّف نام ہے استقامتِ احوال کا حق تعالیٰ کے ساتھ۔

حضرت شیخ محمد بن احمد المقری رحمت اللہ علیہ

# خرقہ پوشی

خرقہ پوشی یا خرقہ، شیخ اور مرید کے مابین ایک رشتہ ارتباط ہے اور مرید کی جانب سے شیخ کی خدمت میں ایک ذریعہ تحکیم ہے، یعنی مرید شیخ کو اپنا حاکم تسلیم کر لیتا ہے۔ جب مصالح دنیوی کے لئے یہ تحکیم شریعت میں جائز ہے اور پسندیدہ امر ہے تو پھر مُنکر خرقہ اس کا کس طرح انکار کرتا ہے جو ایک ایسے طالبِ صادق کو شیخ پہناتا ہے جو اُس کے پاس حُسنِ عقیدت کے ساتھ آیا ہے اور مذہبی امور میں اُس کو اپنا رہبر بناتا ہے تا کہ شیخ اُس کو راہِ ہدایت پر لگائے اور اُس کو آفاتِ نفس کی بصیرت عطا کرے، اعمال کے فساد سے وقوف بخشے اور بتائے کہ نفسِ دشمن کن کن راستوں سے راہ پا لیتا ہے!

اِس طرح مُرید اپنے نفس کو شیخ کے حوالے کر دیتا ہے اور اُس کی رائے کو تسلیم کر لیتا ہے اور تمام معاملات میں اُس کی صوابدید کا پابند ہوتا ہے، پس خرقہ پوشی اِس امر کا اظہار ہے کہ اب شیخ کو اُس پر پورا تصرف حاصل ہو گیا ہے اور جب مرید نے خرقہ پہن لیا تو گویا اُس نے خود کو شیخ کے سپرد کر دیا اور مرید کا شیخ کے حکم تابع ہو جانا اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حکم کا تابع ہو جانا ہے اور اِس طرح وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ بیعت کو تازہ کرتا ہے اور اُس کی تجدید کرتا ہے جو ایک سنت ہے۔

## خرقہ پوشی عین بیعت ھے

شیخ ابو زرعہ رحمت اللہ نے اپنے مشائخ کی اسناد کے ساتھ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے اِس پر بیعت کی کہ ہم تنگی اور فراخی، مسرت اور غم ہر حال میں آپ کے احکام بجا لائیں گے اور ہم اولی الامر کے احکام بجا لانے میں نزاع نہیں کریں گے، ہم جہاں ہوں گے حق بات کہیں گے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہ کھائیں گے۔ پس خرقہ پوشی عین بیعت ہے۔ اس طرح خرقہ صحبت شیخ کے حصول کی دہلیز ہے اور مقصود کلی وہی صحبت شیخ اور اس کی ہم نشینی ہے اور صحبت ہی کے باعث مرید سے خیر کی توقع کی جاسکتی ہے۔

## تصرف و تربیعت شیخ کے اثرات

حضرت ابو القاسم قشریؒ اپنے شیخ ابو علی الدقاقؒ سے روایت کرتے ہیں کہ اس درخت میں جو خود رو ہوتا ہے اور جس کو باغباں نہیں لگاتا اس میں پتے تو نکل آتے ہیں لیکن اس میں پھل نہیں آتا اور وہ ایسا درخت ہے جس کے بارے میں کہا گیا ہے: وَيَجُوْزُ اَنَّهَا تَثْمُرُ كَالَا شُجَارِ الَّتِیْ فِی الْاَوْدِيَةِ وَالْجِبَالِ لٰكِنْ لَّا يَكُوْنُ بِفَا كِهَتِهَا طُعْمُ فَاكِهَةِ الْبَسَاتِيْن (ترجمہ: اور ممکن ہے کہ اس میں پھل بھی آجائے جس طرح پہاڑی جنگلی درختوں میں پھل آ جاتا ہے لیکن اس کا ذائقہ اس پھل کی طرح نہں ہوتا جیسا کہ باغات کے پھلوں کا ہوتا

ہے) اور جب باغبان اس کی پود لگاتا ہے اور پھر ایک جگہ سے نکال کر اس کو دوسری جگہ منتقل کرتا ہے تو اس کی حالت اچھی ہو جاتی ہے۔ اس میں خوب پھل آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر تصرف کیا جاتا ہے، اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، پھر وہ خوب پھلتا ہے جس طرح شریعت نے پڑھائے ہوئے (سدھائے ہوئے) کتے کے علم کا اعتبار کیا ہے (کہ اس کا شکار کیا ہوا جانور حلال کیا اور جو سدھایا ہوا نہ ہو اس کے شکار کو حلال نہیں کیا ہے)۔ میں نے بہت سے مشائخ سے سنا ہے: من لم یر مفلحا لا یفلح (ترجمہ: جس نے فلاح پہنچانے والے کو نہیں دیکھا وہ فلاح نہیں پائے گا)۔ پس ہمارے سامنے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم کا اسوۂ مبارک موجود ہے اور اصحابؓ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم نے آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم سے تمام علوم اور آداب کی تعلیم حاصل کی ہے جیسا کہ بعض اصحابؓ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم نے فرمایا ہے "ہم کو آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم نے ہر چیز کی تعلیم دی یہاں تک کہ مکروہات سے بھی ہم کو واقف کرا دیا"۔ پس جب مرید صادق حکم شیخ کے تحت داخل ہو جاتا ہے (اس کا تابع ہو جاتا ہے) اور اس کی صحبت میں رہتا ہے اور اس سے ادب سیکھتا ہے تو شیخ کی باطنی قوت مرید کے باطن میں اس طرح سرایت کر جاتی ہے جیسے ایک چراغ دوسرے چراغ سے روشن ہو جاتا ہے (شیخ اپنے مرید کے باطن کو بھی روشن کر دیتا ہے)۔ شیخ کا کلام مرید کے باطن کو معمور کر دیتا ہے اور اس وقت شیخ کے ارشادات و مقالات جو حال کے نفائس کا خزانہ ہیں اپنی تمام تر کیفیات کے ساتھ فیض محبت اور سماع کے ذریعہ شیخ سے مرید میں منقل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ صورت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب مرید خود کو شیخ کے لیے وقف کر دے اور اپنے نفسیاتی ارادوں اور اختیار نفس کو ترک کر کے شیخ میں فنا ہو جائے۔

## خرقہ اللّٰہ تک رسائی کا مبرا ہے

اس تائف و رابطۂ الٰہی کی بدولت صاحب و مصحوب کے مابین روحانی نسبت اور فطری طہارت کی مناسبت سے ایک ایسا امتزاج اور ارتباط پیدا ہو جاتا ہے جس کے باعث مرید اپنا رشتہ شیخ سے منقطع نہیں کر سکتا اور اسی طرح ترک اختیار کے ساتھ ادب حاصل کرتے ہوئے وہ شیخ کے ساتھ ترک اختیار کی منزل سے ترقی کر کے اللّٰہ تعالیٰ کے ساتھ ترک اختیار کی منزل پر پہنچ جائے گا (اب اس کا اختیار اس کا نہیں ہو گا بلکہ اللّٰہ تعالیٰ کا اختیار ہو گا)۔ اس وقت وہ خدا کا کلام اسی طرح سمجھنے لگے گا جس طرح شیخ کا کلام سمجھتا تھا۔ اس خیر کل مبدا اور اس روحانی ترقی کا سرچشمہ شیخ کی ملازمت اور صحبت ہے اور خرقہ اس کا مقدمہ اور نقطۂ آغاز ہے۔

## خرقہ پوشی سنت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم ہے

شیخ ابو زرعہؒ نے اپنے شیوخ کی اسناد کے ساتھ حضرت اُم خالدؓ بنت خالدہ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم کی خدمت اقدس میں کچھ کپڑے پیش کئے گئے۔ اس میں ایک چھوٹی سیاہ کملی بھی تھی۔ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و اٰلہ وسلم نے فرمایا "اس کملی کو کون

پہنے گا؟'' یہ سن کر حاضرین خاموش ہو گئے۔ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ''اُم خالدؓ کو میرے پاس لاؤ''۔ چنانچہ میں حاضر خدمت ہوئی تو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے مجھے وہ کملی پہنائی اور دوبارہ فرمایا ''اس کو پہنو اور پرانا کرو''۔ آپ نے اس کملی کی سرخ اور زرد دھاریوں کو دیکھ کر فرمایا ''اے ام خالد! یہ بہت ہی اچھی ہے''۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح اور جس ہیت میں اس زمانے کے شیوخ خرقہ پوشی کرتے ہیں ایسا طریقہ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں نہیں تھا۔ یہ صورت موجود اور اس پر مسلسل عمل اور اس کو ضروری سمجھنا اسی وجہ سے ہے کہ شیوخ اس کو محسن سمجھتے ہیں۔ اس کی اصل تو وہی حدیث ہے جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور اس پر وہ تحکیم شاہد ہے جس کا ہم اس سے قبل ذکر کر چکے ہیں۔ بہر حال اس سے زیادہ موکد رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کا اتباع اور کیا ہو سکتا ہے کہ خلق خدا کو، خدا کی طرف دعوت دی جائے۔ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کا مقصد خاص یہی تھا کہ لوگوں کو اللّٰہ کی طرف بلایا جائے، پس شیخ بھی اس کی اتباع کرتا ہے اور وہ مخلوق کو دعوت حق دیتا ہے۔ اللّٰہ تعالیٰ نے اپنے کلام قدیم (قران مجید) میں امت کی جانب سے رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کو اپنا حاکم (حکم، تسلیم کرنا آیت تحکیم میں بیان کیا گیا ہے) بنایا گیا ہے۔ اس بناء پر مرید کا اپنے شیخ کو حاکم تسلیم کرنا اس آیت تحکم کا احیا اور اس کا تازہ کرنا ہے۔ سورہ نساء میں اس آیت تحکیم میں اللّٰہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً (ترجمہ: پس قسم آپ کے رب کی، وہ ایمان والے نہیں ہیں جب تک وہ آپ کو حکم اور منصف نہ مان لیں اس معاملے میں جس میں وہ آپس میں جھگڑتے ہیں اور اس کے بعد وہ اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اس فیصلے سے جو آپ کر دیں اور وہ اس کو اچھی طرح قبول اور تسلیم کر لیں)۔

اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ حضرت زبیرؓ بن عوام اور ایک دوسرے صحابیؓ نے رسول خدا صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کی خدمت میں حرة میں واقع آب رسانی کی ایک نالی کا تنازعہ پیش کیا۔ دونوں حضرات اس شراج (آب رسانی کی نالی) سے اپنے خرمے کے درختوں کو پانی دیا کرتے تھے۔ حضور صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے تمام معاملہ سن کر ارشاد فرمایا کہ اے زبیر! تم آبپاشی کرو اور اپنے ہمسائے کے لیے پانی جانے دو (اس کو بھی اس شراج سے پانی لینے دو)۔ اس طرح آپ نے آب رسانی میں پہلا حق حضرت زبیرؓ کا تسلیم کیا۔ یہ فیصلہ سن کر وہ صحابیؓ جز بر ہوئے اور کہا کہ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں فیصلہ کیا (رعایت کی)۔ اس سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ ادب سے پیش آنے کی تعلیم دی گئی اور اس ادب کو شرط ایمان قرار دیا گیا یعنی ظاہر اور باطنی اطاعت و رضا شرط ایمان ہے۔

## شیخ کے تصرفات باطنی

پس یہی شرط مرید کے لیے شیخ کے ساتھ ہے جب کہ وہ اس کو اپنا حاکم تسلیم کرے۔ پس خرقہ

پہن لینا گویا اس بات کا اقرار ہے کہ اس نے تمام حالات میں شیخ کو متہم کرنے یا اس پر اعتراض کرنے سے خود کو محفوظ کر لیا ہے اور شیخ پر اعتراض مریدوں کے حق میں زہر قاتل ہے اور وہ مرید جو شیخ کے تصرفات باطنی پر اعتراضات کرتا ہے اور ارادت میں کامیاب نہیں ہو سکتا اس کو فلاح میسر نہیں آ سکتی۔ جب شیخ کے باطنی تصرفات مرید کے فہم میں نہ آئیں تو اس وقت اس کو حضرت موسیٰ علیه السلام اور حضرت خضر علیه السلام کا قصه یاد کرنا چاہیے که کس طرح حضرت موسیٰ علیه السلام نے حضرت خضر علیه السلام کے باطنی تصرفات پر اعتراض کئے تھے لیکن جب اصل حقیقت ان پر ظاہر کی گئی تو موسیٰ علیه السلام کو اس میں وجه صواب نظر آئی اور یه تسلم کرنا پڑا که جو کچھ حضرت خضر علیه السلام نے کیا وہ درست تھا۔

## خرقه پهنانے میں نیابت رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم هے

پس مرید کو سمجھ لینا چاہیے که شیخ کے ان تمام تصرفات میں مرید کو بظاہر اشکال نظر آتا ہے، شیخ کے پاس اس کی صحت کی حجت اور دلیل موجود ہے۔ شیخ جو کچھ کر رہا ہے وہ درست ہے۔ مرید کو یه بھی سمجھنا چاہیے که شیخ کے خرقه پہنانے میں شیخ کا ہاتھ رسول اکرم صلی الله علیه وآله وسلم کی نیابت کر رہا ہے اور آپ کے دست مبارک کا قائم مقام ہے۔ پس وہ شیخ کی قیادت کو تسلیم کر کے الله اور اس کے رسول اکرم صلی الله علیه وآله وسلم کی قیادت کو تسلیم کر رہا ہے، جیسا کے الله تعالیٰ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَا یِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَا یِعُوۡنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡھِمۡ فَمَنۡ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنۡکُثُ عَلٰی نَفۡسِہٖ (ترجمه: اے پیغمبر! وہ لوگ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت خدا کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے پس جو کوئی اس بیعت کو توڑے گا وہ اپنے ہی نقصان کے لئے توڑے گا)۔

## فیضان خرقه پوشی

چنانچه جب شیخ مرید کو خرقه پہناتا ہے تو وہ مرید سے خرقه کی شرائط بجا لانے کا عہد و پیمان لیتا ہے اور اس کو خرقه پوشی کے تمام حقوق سے آگاہ کر دیتا ہے۔ پس شیخ مرید کے لئے ایک ایسی صورت ہے جس کے پیچھے مطالبات الٰہی اور مرضیات نبوی اس کو نظر آتی ہیں۔ شیخ کے توسط سے مرید فرائض الٰہی اور سنت رسول اکرم صلی الله علیه وآله وسلم سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ یه چیزیں اس کو بالکل اسی طرح نظر آتی ہیں جیسے تنگ لباس سے اعضائے جسمانی نظر آتے ہیں۔ اس وقت مرید کا یه اعتقاد اور بھی راسخ اور پخته ہو جاتا ہے که شیخ ایک دروازہ ہے جس کو الله تعالیٰ نے اپنے آستانۂ لطف و کرم کی طرف کھول دیا ہے جہاں سے وہ آستانۂ کرمِ الٰہی میں داخل ہوتا ہے اور لوٹ کر وہیں پہنچ جاتا ہے۔ پھر شیخ ہی کے ساتھ اس کی تمام وارداتیں دینی اور دنیوی مہمات سر انجام ہوتی ہیں اور اس کا یه اعتقاد ہوتا ہے که اس پر خداوند تعالیٰ جو فضل و کرم نازل فرما رہا ہے وہ شیخ ہی کی بدولت اور اسی کے واسطه سے نازل ہو رہا ہے اور جس طرح وہ اپنے شیخ کی طرف رجوع ہوتا ہے اسی طرح شیخ اس کے لیے الله تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتاہے اور الله تعالیٰ کے

لطف و کرم کا دروازہ شیخ کے لئے خواہ وہ عالم بیداری میں ہو یا حالت خواب میں ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ شیخ بھی ہوائے نفسانی سے مرید کے معاملات میں کام نہیں لیتا کیونکہ مرید شیخ کے پاس اللہ تعالیٰ کی ایک امانت ہے اور وہ خداوند تعالیٰ کے حضور میں مرید کی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے فریاد کرتا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ سے وہ اپنی ضروتوں اور اپنی دینی اور دنیاوی حالتوں کے پورا کرنے لئے فریاد کرتا ہے۔

## شیخ کا استغاثہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَ حْيًا اَوْمِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلاً (ترجمہ: اور کسی آدمی کی یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اللہ سے کلام کرے مگریہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل میں القاء فرما دے یا پردے کے پیچھے (بذریعہ الہام) سے یا کسی رسول (قاصد) کو بھیجے)۔ لہٰذا قاصد یا وحی کے ذریعہ کلام کرنا تو پیغمبروں اور رسولوں کے ساتھ مخصوص ہے، البتہ پردے کے پیچھے یعنی بذریعہ الہام و القاء ہاتف غیبی یا خوابوں کے ذریعے مشائخ اور جلیل القدر علماء سے کلام فرماتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ انہی واسطوں میں سے کسی واسطے سے بغیر وحی اور قاصد کے مشائخ کے استغاثوں کا جواب دیتاہے اور ان سے کلام فرماتا ہے۔

## محبت شیخ کے مدارج و مراتب

مریدین کی صحبت شیخ کے ساتھ دو مراتب و مدارج میں تقسیم ہے، پہلا مرتبہ شیر خوارگی کے مانند ہے اور دوسرا مرتبہ ترک شیر خوارگی کا ہے۔ شیر خوارگی کا دور وہ زمانہ ہے جب مرید شیخ کی صحبت میں ہمہ وقت حاضر رہتا ہے۔ شیخ کو اس خوارگی کی مدت کا علم ہوتا ہے۔ پس مرید کو چاہیے کہ شیخ کی اجازت کے بغیر اس سے جدا نہ ہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے امت محمدیؐ کو ادب سکھانے اور سیکھنے کے سلسلہ میں سورۃ نور میں ارشاد فرمایا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْابِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْ مَعَهٗ عَلٰى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْ احَتّٰى يَسْتَا ذَنُوْهُ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَا ذِنُوْكَ اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْ مِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِذَا اسْتَاذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَانِهِمْ فَاذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ (ترجمہ: مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایمان لائے ہیں اور جب وہ اس کے ساتھ کسی کام میں شریک (جمع) ہوتے ہیں تو وہاں سے اس وقت تک نہیں جاتے جب تک اس سے اجازت حاصل نہ کر لیں، لہذا جب وہ آپ سے (جانے کی) اجازت مانگیں تو آپ ان میں سے جس کو چاہیں اجازت دے دیا کریں)۔

امر جامع، دینی کام سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے پس شیخ مرید کو خود سے جدا ہونے کی اجازت اس وقت دیتا ہے جب وہ جان لیتا ہے اور اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ اب اس کی شیر خوارگی چھڑانے کا زمانہ آ گیا ہے یعنی اب مرید کو جدا ہو جانا چاہیے اور شیخ یہ اندازہ کر لیتا ہے کہ اب اس (مرید) کو اپنے نفس پر قابو حاصل ہو گیا ہے اور استقلال نفس (مختاری) سے کام کر سکتا ہے۔ مرید کے استقلال نفس کا ثبوت یہی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی مرضیات کے سمجھنے کا دروازہ کھل جائے۔ جب مرید اس مرتبہ پر پہنچ

جائے کہ وہ اپنے حوائج اور مہمات کو بالواسطہ خداوند تعالیٰ کے حضور میں پیش کر سکے اور خدواند تعالیٰ اپنے سائل محتاج بندے کو ہدایات اور تنبیہات کرتا ہے اس کا فہم اس میں پیدا ہو جائے تب سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی شیر خوار گی کی مدت ختم ہو گئی اور اگر وہ شیرخوار گی کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی شیخ سے جدا ہو گیا تو پھر وہ ان بدعتوں میں پھنس جائے گا جو دنیا کی طرف رجوع کرنے والی ہیں اور وہ خواہشات کی پیروی کرنے لگے گا اور اس کو ایسی ہی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے گا جیسی اس شیرخوار بچے کو پیش آتی ہیں جس کا دودھ قبل از وقت چھڑا دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس مرید کے لئے جو خرقۂ ارادت پہن لیتا ہے شیخ کی صحبت میں رہنا ضروری ہے۔

## خرقہ ارادات اور خرقہ تبرک

خرقہ مشائخ دو طرح کا ہوتا ہے، ایک خرقہ ارادت اور ایک خرقہ تبرک۔ مشائخ اپنے مریدین کے لئے جو خرقہ اختیار کرتے ہیں اور انہیں پہناتے ہیں وہ خرقہ ارادت ہے، خرقہ تبرک، خرقہ ارادت سے ملتا جلتا خرقہ ہوتا ہے، خرقہ ارادت مرید حقیقی کے لیے مختص ہے اور خرقہ تبرک متشبہ کے لیے (مرید غیر حقیقی) جو حقیقتاً مرید نہیں لیکن ان جیسا بننا چاہتا ہے۔

خرقہ کا راز یہ ہے کہ جب ایک طالب صادق شیخ کی صحبت میں داخل ہوتا ہے اور خود کو شیخ کی سپردگی میں دے دیتا ہے تو اس وقت ایک چھوٹے بچے کی طرح ہوتا ہے جو اپنے باپ کے پاس اور اس کی نگہداشت میں ہوتا ہے اور شیخ کو فقر صادق اور حسن استقامت کی بدولت جو کچھ علم حاصل ہوا ہے وہ اسی علم باطن اور اپنی زبردست بصیرت کے مطابق اپنے اس مرید کے باطن کی نگرانی کرتا ہے۔ چنانچہ اگر مرید اپنے زہد پر اعتبار کرتے ہوئے زاہدوں اور قانع دریشوں (متقشفین) کی طرح موٹا اور کھردرا لباس پہننا شروع کر دیتا ہے اور ابھی وہ اس کا اہل نہیں ہوا ہے اور اس کے نفس میں جو ایک پوشیدہ خواہش ہے اس کی بنا پر وہ چاہتا ہے کہ یہ لباس پہننے کے بعد اس کو زاہد سمجھاجائے تو شیخ اس کے اس باطن سے خبردار ہو کر اس کو نرم و لطیف لباس پہنواتا ہے اور اگر مرید کی یہ خواہش ہوتی ہے اور اس کا نفس چاہتا ہے کہ وہ چھوٹی آستین یا لمبی آستین اور فراک دامن کا مخصوص لباس پہنے یا وہ نرم یا سخت لباس میں سے بلتخصیص کسی ایک لباس کو پسند کرتا ہے تو شیخ اس کو ایسا لباس پہنواتا ہے جس سے اس کو جھوٹی خواہش نفسانی کو شکست ہو اور کبھی مرید بدن پر نرم اور باریک کپڑے پہنے ہوتے ہیں! اس کو کسی مخصوس طرز اور وضع کے لباس کی خواہش ہوتی ہے تو شیخ اس کی خواہش کو مٹانے اور پامال کرنے کے لئے اس کے خلاف لباس پہناتا ہے۔

## شیخ مرید کے اطوار کی اصلاح کرتا ہے

جس طرح شیخ لباس کے معاملہ میں مرید کی اصلاح کرتا ہے اسی طرح وہ مرید کے کھانے پینے، روزہ رکھنے، نہ رکھنے اور دوسرے دینی کاموں میں تصرف کرتا ہے اور ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جس میں مرید

کی بھلائی ہو۔ چنانچہ کبھی وہ اس کو ہر وقت ذکر میں مشغول رکھتاہے، نماز (فرائض) کے ساتھ نفلوں کا پڑھنا ضروری کر دیتا ہے، تلاوت کلام اللہ میں مصروف رکھتا ہے یا دوسروں کی خدمت میں لگا دیتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کو کسب معاش میں لگا دیتا ہے، کبھی فتوح و نذرانے پر گزر بسر کرنے کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ غرض کہ شیخ کو انشراح باطن ہوتا ہے اور مختلف مریدوں کی مختلف استعدادات پر اس کو اطلاع ہوتی ہے۔ جو مرید جیسی اصلاح اور تربیت کا اہل ہوتا ہے ویسی ہی اس کی اصلاح اور تربیت کی جاتی ہے اور مرید کو معاد و معاش میں اس کی استعداد کے مطابق حکم دیتا ہے کہ اسی میں اس کی اصلاح حال پنہاں ہوتی ہے۔ چونکہ مریدوں کی استعداد و صلاحیت مختلف ہوتی ہے اس لئے ان کی معاد و معاش کے سلسلہ میں احکام بھی مختلف ہوتے ہیں۔

## دعوت مراتب کا فرق استعداد کے اختلاف کے باعث ہے

چونکہ مریدوں کی استعداد میں تنوع اور اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے ان کی دعوت ہدایت کے طریقے بھی مختلف ہوتے ہیں جیسا کہ سورۃ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بَالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَن (ترجمہ: اے رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم! آپ اللہ کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت، عمدہ نصیحت کے ساتھ بلائیں اور ان سے احسن طریقے پر بحث کریں)۔

اس سے ثابت ہوا کہ دعوت ہدایت کے تین مراتب ہیں، حکمت، موعظت اور مجادلہ (بحث)۔ پس جس کو حکمت کے ذریعہ دعوت دی جائے گی اس کو موعظمت اور مجادلہ کے ذریعہ دعوت نہیں دی جائے گی اور جس کو موعظمت اور مجادلہ کے ذریعہ دعوت کی ضرورت ہے اس کے لئے حکمت کا ذریعہ سود مند نہیں ہو گا۔ ہر ایک کا مرتبہ الگ الگ ہے۔ پس شیخ کو اس کا علم ہوتا ہے کہ مریدوں اور طالبان حق میں کون ابرار کی وضع پر ہے اور کون مقربین کے ڈھنگ اور طرز پر ہے۔ کس کو ذکر دوام کی ضرورت ہے اور کس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ ہمشہ نمازیں پڑھتا رہے اور کون ایسا ہے کہ اس کے لئے موٹے کپڑے یا باریک کپڑے پہنانا مناسب ہے۔ اس طرح وہ مرید کی عادت چھڑا کر اس کو نفس ضغہ سے نکال لیتا ہے اور پھر اس کو اپنے اختیار سے، اس کی حالت کے مطابق، کھلاتا ہے اور اپنے اختیار سے جیسا اس کے مناسب حال ہوتا ہے لباس پہناتا ہے اور اس کی وضع اور ہیئت معین کرتا ہے اور اس طرح مخصوص خرقہ اور ہیئت سے اس کی خواہشات نفسانی کا علاج کرتا ہے اور اس طرح وہ مرید کو راضی برضائے الٰہی ہونے کی تربیت دیتا ہے اور مقام رضا کے قریب لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔

## حقیقی مرید ایک مار گزیدہ شخص کی طرح ہے

وہ مرید صادق جس کا باطن آتش ارادت سے شعلہ بار ہے وہ ابتدائے کار (کار ارادت) اور شدت ارادت میں ایک مار گزیدہ شخص کی طرح ہوتا ہے جو (زہر کا اثر زائل کرنے کے لیے) دوا دارو اور جھاڑ پھونک کرنے والے کا متلاشی اور حریص ہوتا ہے۔ وہ ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ کوئی ایسا مل جائے جو یہ اثر زائل کر دے اور

جب اسے ایسا شیخ مل جاتا ہے تو شیخ کے باطن سے ایسے مرید کے لئے خود بخود ایک توجہ صادق نمودار ہوتی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شیخ کو اس کی سچی ارادت سے آگہی ہے اور خود مرید کا باطن بھی شیخ کی محبت سے معمور اور لبریز ہو جاتا ہے۔ دلوں کی یہ باہمی الفت اور ارواح کی یہ باہمی قربت اور ازل سے دونوں میں جو باطنی رابطہ تھا اس کا یہ ظہور محض اللہ کے لئے، اللہ کی طرف سے، اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ کوئی نفسانی غرض اس میں شامل نہیں ہوتی، محض اللہ تعالیٰ کے لئے یہ رابطہ اور تعلق پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ قمیص جو مرید صادق سے حاصل کرتا ہے اور شیخ پہناتا ہے وہ ایک ایسا خرقہ جو مرید کو اس امر کی بشارت اور نوید دیتا ہے کہ شیخ کی خصوصی توجہ اس کے حال پر مبذول ہے اور یہ خرقہ (قمیص) مرید کے لیے وہی کام کرتا ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے ساتھ کیا کہ ان کی بصارت واپس آگئی۔

## قمیص یوسف علیہ السلام کی اصل کیا تھی؟

منقول ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں ڈالے گئے تو آپ کے بدن سے تمام کپڑے اتار لئے گئے تھے اور آپ کو برہنہ آتش نمرود میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام ان کے لئے بہشت سے حریر کا ایک حلہ لے کر آئے اور ان کو پہنایا۔ مدتوں یہی حلہ (قمیص) حضرت ابراہیمؑ کے پاس رہا، پھر ان سے ان کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کو ورثہ میں ملا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس ترکہ میں پہنچا، حضرت یعقوب علیہ السلام نے اس قمیص کو ایک تعویذ میں رکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کے گلے میں ڈال دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس تعویذ کو ہمیشہ پہنے رہتے تھے اور خود سے کبھی جدا نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کو (بھائیوں نے) برہنہ کنوئیں میں ڈال دیا تو جبرئیل علیہ السلام ان کے پاس آئے اور آپ کے تعویذ سے وہ قمیصِ ابراہیمی نکال کر حضرت یوسف علیہ السلام کو پہنا دی۔

شیخ مجاہدؒ باسناد شیوخ مروی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام بہت زبردست عالم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علم سے نوازا تھا لیکن ان کو یہ علم نہیں تھا کہ ان کی اس قمیص سے یعقوب علیہ السلام کی بصارت (جو ان کے فراق میں روتے روتے زائل ہو گئی تھی) واپس آ جائے گی کیونکہ یہ قمیص حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی۔ اسی سلسلہ میں حضرت مجاہدؒ مزید فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم اپنی قمیص (باپ کے پاس کنعان) بھیج دو، اس لئے کہ اس میں بہشت کی خوشبو ہے۔ یہ جس مصیبت زدہ یا بیمار کو سنگھائی جاتی ہے وہ تندرست ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے ایسا ہی کیا اور ان کو بینائی واپس مل گئی۔

اسی طرح شیخ کا خرقہ بھی مرید صادق کے لئے جنت کی خوشبو سے بسا ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور ذکر کے سلسلہ میں آیا ہے اور خرقہ کا پہننا اس قبیل سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور اس کا فضل اس مرید کے شامل حال ہے۔ یہ تو تھی صورت خرقہ ارادت کی، اب ہم خرقہ تبرک کے سلسلہ میں

وضاحت کرتے ہیں۔

## خرقہ تبرک کی طلب

جو شخص خرقۂ تبرک کا خواہاں ہے تو اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ وہ صوفیہ کے اس لباس سے برکت حاصل کرے۔ اس میں وہ تمام شرائط ملحوظ نہیں رکھے جاتے جو خرقۂ ارادت کے لئے ضروری ہیں بلکہ ایسے شخص کو جسے یہ خرقہ دیا جاتا ہے نصیحت کی جاتی ہے کہ وہ حدود شرعیہ کی پابندی کرے اور صوفیاء کی جماعت کے ساتھ اٹھے بیٹھے تا کہ اس کی برکات سے مستفید ہو اور ان سے علوم آداب حاصل کرے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خرقۂ تبرک حاصل کرنے والا خرقۂ ارادت حاصل کرنے کا اہل بن سکے۔ یہی وجہ ہے کہ خرقۂ تبرک تو ہر طالب حقیقت کو دیا جا سکتا ہے لیکن خرقۂ ارادت صرف طالب صادق ہی کے لیے مخصوص ہے، باقی لوگوں کے لیے ممنوع ہے۔

## خرقہ کس رنگ کا ہونا چاہیے

نیلی فام خرقہ مشائخ کی نظر میں مستحسن اور پسندیدہ ہے اور اگر شیخ کی خواہش ہے کہ مرید نیلگوں خرقہ یا لباس کے علاوہ کسی اور رنگ کا لباس یا خرقہ پہنے تو کسی کو اس پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ مشائخ کی آرا تقاضائے وقت کے مطابق ہوتی ہیں اور جو کچھ وہ کرتے ہیں بہ تقاضائے وقت کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے پیر طریقت کا ارشاد ہے کہ ”ایک فقیر چھوٹی آستین کا لباس پہنتا تھا تا کہ وہ خدمت کے وقت اس کا معاون ہو (خدمت کے وقت چھوٹی آستینیں ہارج نہ ہونگی)“۔ شیخ کے لیے اس امر میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ وہ مرید کو متعدد خرقے متعدد بار پہنائے۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ وہ مختلف قسم کے رنگ دار یا سادہ خرقوں سے اس کی خواہشاتِ نفسانی کا علاج کرنا چاہتا ہے اور عام طور پر مشائخ جو نیلا رنگ پسند کرتے ہیں اس میں خوبی یہ ہے کہ نیلا رنگ میل کو چھپاتا ہے اور اسے جلد جلد دھلوانے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے یہی رنگ درویش کے لیے زیادہ مناسب سمجھا گیا ہے۔ بعض ارباب تصوف نے نیلے رنگ کے سلسلہ میں جو مختلف توجیہات کی ہے وہ سب تصنع پر مبنی ہیں اور اپنے قول کو باور کرانے کے لیے پیش کی ہیں، حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ دین سے ان کا کوئی واسطہ اور رابطہ ہے۔

## لباسِ کثیف کی توجیہ

میں نے حضرت شیخ سدید الدین ابو الفخر ہمدانیؒ سے سنا کہ آپ نے فرمایا ”ایک مرتبہ میں بغداد میں شیخ ابو بکر الشروطیؒ کے پاس مقیم تھا۔ زاوئیے سے ایک فقیر نکل کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کا لباس بہت میلا تھا۔ بعض فقیروں نے اس سے کہا کہ تم اپنے کپڑے کیوں نہیں دھوتے؟ اس فقیر نے جواب دیا کہ مجھے اتنی فرصت کہاں ہے بھائی!“۔ شیخ ابو الفخرؒ فرماتے ہیں ”میں اس فقیر کے جواب کہ مجھے اتنی فرصت

کہاں ہے کی لذت آج بھی اپنے دل میں پاتا ہوں۔ واقعی اس فقیر کا یہ کہنا بالکل درست تھا اس لئے میں اس کی بات یا د کر کے اس سے لطف اندوز ہوتا ہوں"۔ اربابِ طریقت نے رنگین لباس اسی وجہ سے پسند کیا کہ وہ شغل (ذکر الٰہی) میں مشغول رہتے ہیں اور ان کو لباس دھونے کی فرصت کم ملتی ہے۔ اب اگر شیخ مرید کے لیے سفید لباس یا کسی اور رنگ کا لباس تجویز کر دے تو اس کو اس کا حق ہے۔ اس میں کوئی اچھا مقصد پنہاں ہے اور اس کا وفور علم اس کا حق رکھتا ہے۔ ہم نے بعض ایسے مشائخ بھی دیکھے ہیں کہ وہ مریدوں کو خرقہ نہیں پہناتے اور بہت سے حضرات ان سے بغیر خرقہ ہی کے آداب سلوک حاصل کرتے ہیں اور علوم معرفت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

## بزرگان سلف میں بعض حضرات خرقہ سے واقف نہیں تھے

بزرگان سلف میں اکثر مشائخ خرقہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے چنانچہ وہ اپنے مریدوں کو خرقہ نہیں پہناتے تھے۔ پس جو مشائخ خرقہ پہناتے ہیں ان کا مقصد بھی نیک ہے اور عمل صحیح ہے۔ اس کی اصل سنت سے ثابت ہے اور شریعت میں موجود ہے اور جو نہیں پہناتے ان کا طریقہ بھی درست ہے اور ان کا مقصد بھی نیک ہے۔ مشائخ خواہ کوئی طریقہ اختیار کریں ان کے تصرفات صحیح اور ہدایت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کی نیت نیک و صالح ہوتی ہے خواہ وہ کوئی کام کریں اور اللہ تعالیٰ ان کے ذریعے ان کے آثار سے انشاء اللہ خلق خدا کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

**حوالہ: عوارف المعارف از شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی رحمت اللہ علیہ۔**

## حدیثِ دل

تصوّف آداب کا نام ہے، ہر وقت کے آداب، ہر مقام کے آداب، اور ہر حال کے آداب۔ پس جس نے اِن آداب کو لازم پکڑا بلند مقام پر پہنچا اور جس نے آداب کہ پابندی نہ کی وہ دُور پھینکا جاتا ہے اور مردود کیا جاتا ہے اِس فخر و غرور کی وجہ سے کہ اپنے آپ کہ مقرّب و مقبول سمجھتا ہے۔

حضرت ابو حفص نیشاپوری رحمت اللہ علیہ

# تصوف اور اسلام

حضرت سید علی ہجویری رحمت اللہ علیہ فرماتے ہیں "تصوف کا انکار ساری شریعت کا انکار ہے"۔ آپ کے مسلک تصوف پر روشنی ڈالنا بہت ضروری ہے کیونکہ آج کل کے زمانے میں یورپ کے متعصب مصنفین نے جن کو عرف عام میں "مستشرقین" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، عیسائی مذہب کو اسلام سے افضل ثابت کرنے اور عیسائی اقوام کو مسلمانوں پر حکومت کرنے کا جواز پیدا کرنے اور ان کو حکومت کا مستحق ثابت کرنے کے لیے اسلام کی ہر چیز کی مذمت کی ہے اور چونکہ اسلام دنیا بھر میں صوفیائے کرامؒ کی بدولت پھیلا ہے، نام نہاد مستشرقین نے صوفیائے کرامؒ اور ان کے مسلک تصوف کو خاص طور پر مذمت کا نشانہ بنایا ہے تا کہ ایک تو اسلامی ممالک پر اقوام مغرب کی حکومت برقرار رہے، نیز عیسائی لوگ آئندہ مسلمان ہونے سے رک جائیں کیونکہ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ اب بھی یورپ اور امریکہ میں خشک مادیت اور لادینیت کی وجہ سے لوگ سکون قلب کھو بیٹھے ہیں اور اولیائے اسلام مثل امام غزالیؒ، ابنِ عربیؒ، رومیؒ، اور جنیدؒ کی کتابوں کے مطالعہ سے سکون قلب حاصل کر کے اسلام قبول کر رہے ہیں۔

تصوف کے خلاف عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ لفظ تصوف رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مروج نہیں تھا۔ اگر تصوف اس وجہ سے غیر اسلامی ہے کہ یہ لفظ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں مروج نہیں تھا تو تمام اسلامی علوم مثل تفسیر، حدیث، فقہ، معانی، بیان اور صرف و نحو بھی غیر اسلامی ہوئے کیونکہ یہ الفاظ بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں مروج نہیں تھے۔ صحابہ کرامؓ ہر وقت جہاد میں مصروف تھے اور ان کے علوم کو باقاعدہ علم کی صورت میں مرتب کرنے کی ان کو فرصت نہیں تھی۔ لیکن جب جہاد کا زمانہ ختم ہوا تو صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ ان علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ جن حضرات نے قرآن کے معانی و مطالب پر کام کیا وہ مفسرین کے نام سے موسوم ہوئے اور ان کے علم کا نام علم تفسیر ہوا۔ جنہوں نے حدیث پر کام کیا وہ محدثین کہلائے اور ان کا علم، علم حدیث کے نام سے موسوم ہوا۔ جن حضرات نے اسلام کے قانون پر کام کیا وہ فقیہ کہلائے اور ان کے مرتب کردہ علم کا نام فقہ ہوا۔ جن حضرات نے اصحابہ صفہؓ کی دیکھا دیکھی میں تزکیۂ نفس اور روحانیت میں کمال حاصل کیا وہ صوفی کہلائے اور ان کا علم تصوف کے نام سے موسوم ہوا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ صحابہ کرامؓ علم تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف سے بے بہرہ تھے۔ بلکہ وہ سب سے بڑے مفسر، محدث، فقیہ اور صوفی تھے، لیکن ان ناموں سے موسوم نہیں تھے۔ بالفاظ دیگر ان کے ہاں حقیقت تھی نام نہیں تھا اور آج کل نام ہے حقیقت بہت کم پائی جاتی ہے۔

تصوف کی دوسری وجہ تسمیہ یہ ہے کہ متقی لوگ نفس کشی کی خاطر اکثر اون کا لباس پہنتے تھے جسے عربی زبان میں صوف کہا جاتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ صوفی کے نام سے موسوم ہونے لگے۔ لیکن تصوف کی حقیقت دراصل مرتبہ احسان ہے جس کی تشریح رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حدیث جبریل میں

یوں فرمائی ہے "اس طرح عبادت کرو کہ تم خدا تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اگر دیکھ نہیں سکتے تو پھر یہ خیال کرو کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے"۔ چنانچہ یہی مشاہدۂ حق صوفیائے کرام کا منتہائے نظر رہا ہے جس کے حصول کے لیے انہوں نے غلبۂ نفس کو کم کرنے کے لئے مجاہدات اور ریاضات سے کام لیا۔ لیکن بعض علمائے ظواہر جو "مولانا" کے القاب سے آراستہ و پیراستہ ہیں کے ان کلمات کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے "اسلامی عبادات کا پروگرام تو بہت مختصر تھا، صوفیوں نے خواہ مخواہ مجاہدات و ریاضت کر کے اپنے آپ کو سزا دی ہے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان مولانا صاحبان نے قرآن حکیم کی مندرجہ ذیل آیت کو نہیں پڑھا جس میں حق تعالیٰ نے اپنے ان مخلص بندوں کی تعریف فرمائی ہے جن کے بدن رات کو بستروں سے علیحدہ رہتے ہیں۔ قرآن کے الفاظ ہیں: "تَتَجَافى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَا جِعِ"۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے قرآن کی یہ آیت بھی نہیں پڑھی: "يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًاوَّ قِيَاماً" (ترجمہ: اللہ کے مخلص بندگان رات اپنے رب کے حضور میں سجدہ و قیام میں بسر کرتے ہیں)، اور نہ ہی شاید کبھی اس آیت پر عمل فرمایا ہے: "رات کو اٹھو لیکن کم، نصف رات ہو یا اس سے کچھ کم یا کچھ زیادہ اور تلاوت قرآن کرو اچھی طرح، کیونکہ رات کا جاگنا نفس کشی کے لئے بہت سخت ہے اور بات کو مضبوط کرتا ہے یعنی آدمی مستجاب الدعوات ہو جاتا ہے"۔

تصوف کسی نئے مذہب کا نام نہیں بلکہ قربِ حق کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل حدیث قدسی (بخاری) کے مطابق فرائض اور واجبات کے علاوہ زائد عبادت کا اصطلاحی نام تصوف پڑ گیا ہے، جس طرح قرآن کے مطالب پر غور کرنے کا نام علم تفسیر ہو گیا ہے۔ حدیث قدسی: "اللہ تعالی فرماتا ہے کہ میرا جو بندہ نوافل (زائد عبادت) کے ذریعے میرا قرب حاصل کرنا چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں (یعنی وہ میرا محبوب بن جاتا ہے) او اس سے اس قدر قریب ہو جاتا ہوں کہ اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے دیکھتا ہے، میں اس کے کان بن جاتا ہوں اور وہ مجھ سے سنتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں اور میری طاقت سے کام کرتا ہے اور میں اس کے پاؤں بن جاتاہوں اور مجھ سے چلتا ہے اور مجھ سے جو کچھ طلب کرتا ہے اس کو دیتا ہوں اور جب میری پناہ طلب کرتا ہے تو پناہ دیتا ہوں"۔

علم روحانیت کی اصطلاح میں اس قسم کے قرب کو فنا فی صفات اللہ کہا جاتا ہے۔ اس سے اوپر کا درجہ فنا فی ذات اللہ ہے اس کے بعد فناء الفناء ہے جہاں پر یہ شعور بھی مٹ جاتا ہے کہ فانی فی اللہ ہے۔ اس کے بعد مقامِ بقا باللہ ہے کہ جب سالک نزول کر کے اپنی خودی میں واپس آ جاتا ہے اور فرائض زندگی انجام دیتا ہے۔ یاد رہے کہ جہاں مقامِ فنا میں استغراق اور محویت ہے، مقامِ بقا میں ہوشیاری ہے۔ اس لیے مقامِ فنا کے سالک کو ابن الوقت اور مقامِ بقا کے سالک کو ابو الوقت کہا جاتا ہے۔ مقامِ فنا پر سالک مغلوب الحال ہوتا ہے۔ مقامِ بقا پر غالب الحال ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ فنا فی اللہ کا سالک ہمیشہ فنا میں اور بقا باللہ کا سالک ہمیشہ بقا میں رہتا ہے، بلکہ جب چاہتا ہے فنا میں چلا جاتا ہے اور جب چاہتا ہے بقا میں واپس آ جاتا ہے۔ مقامِ فنا کو عروج اور مقامِ بقا کو نزول اور عبدیت کے ناموں سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور مقامِ عبدیت یا عبودیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ و الہ وسلم کا خاصہ ہے۔ جہاں پہلی امتوں میں فنا فی اللہ آخری مقام تھا، اسلام میں بقا باللہ آخری مقام ہے کیونکہ اس مقام پر سالک بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی

باللہ بھی۔ وہ بیک وقت ذاتِ حق کے ساتھ وصال کے مزے بھی لیتا ہے اور درد فراق کی لذت سے بھی محفوظ ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقام کو جامعیت کہا جاتا ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے:

من لذتِ دردِ تو بہ درماں نفر و شم
کفرِ سرِ زلفِ تو بہ ایماں نفر و شم

عارف شیرازی رحمت اللہ علیہ نے مقام جامعیت کو یوں بیان فرمایا ہے:

عجب ایں نیست کہ سر گشتہ بود طالب دوست
عجب ایں است کہ من واصل و مہجورم

عارف رومی رحمت اللہ علیہ نے اس مقامِ جامعیت کویوں بیان فرمایا ہے

دل آرام دربر دل آرام جوئے
ہمچو مستسقی تشنہ برآب جوئے

نیز عارف شیرازی رحمتہ اللہ فرماتے ہیں:

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

جب حضرت صدر الدین قونوی رحمت اللہ سے کسی نے مندرجہ ذیل رباعی کا مطلب دریافت کیا:

صوفی چہ فغاں است من این الٰی این
کیں نکتہ عیان است من العلم الٰے العین
مالحاصل فی بحر چہ پرسی سفرے کن
چوں خضر بجوئے گوہر از مجمع بحرین

تو آپ نے جواب دیا ''تجدد نسبتہ جامعتہ بن الطرفین ظاہرۃ بالحکمین''۔ اس سے مراد وہی مقامِ جامعیت ہے کہ جس وقت سالک بیک وقت فانی فاللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ حضرت خواجہ غلام فرید رحمت اللہ

علیہ نے اس مقامِ جامعیت کو یوں بیان فرمایا ہے: "شدہ عکس در عکس ایں بنا" یعنی فنا بقا ہے بقا فنا۔

جب حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمت اللہ علیہ اس مقام پر پہنچے تو اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کو خط لکھا "اب میری حالت یہ ہے کہ قرب بھی بُعد بن گیا ہے"۔ قرب کا بُعد بن جانا اس وقت سمجھ میں آسکتا ہے جب انسان کی ان مقامات تک رسائی ہوتی ہے۔

## خلافتِ الٰہیہ

حق تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے "اِنِّیْ جَاعِلٌ" فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ط"۔ خلیفہ کا مطلب ہے نائب۔ نائب وہ ہوتا ہے جو بادشاہ کی طرف سے اختیارات لے کر حکومت کرتا ہے۔ چنانچہ انسانِ کامل جب مقامِ فنا فی اللّٰہ پر مندرجہ بالا حدیث قدسی کے مطابق صفات اللّٰہ سے متصف ہوتا ہے تو اس کے سر پر خلافتِ الٰہیہ کا تاج رکھ کر اسے دنیا پر بطور خلیفۃ اللّٰہ حکومت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آج کل جو لوگ خلافت الٰہیہ کے قیام کے نعرے لگا رہے ہیں جب تک وہ مقامات فنا اور بقا تک رسائی حاصل نہیں کرتے خلافت کے قابل نہیں ہو سکتے۔

اب ہم قارئین کو بتانا چاہتے ہیں کہ فنا فی اللّٰہ اور بقا با اللّٰہ جیسے بلند مقامات قرب و وصال کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ انسان مجموعہ ہے روح اور جسم کا۔ جسم کا تعلق اس مادی دنیا سے ہے اور "کل شئی یرجع الی اصلہ" کے مطابق جسم یعنی جسمانی خواہشات یا نفسانی خواہشات انسان کو نیچے کی جانب کشش کرتی ہیں۔ اس کے برعکس روح کا تعلق، بمصداق آیہ مبارک "وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ" عالم بالا یعنی حق تعالی سے ہے، اس لئے وہ انسان کو اوپر کی جانب کشش کرتی ہے۔ چنانچہ روح اور جسم کے درمیان اس کشمکش اور جنگ کا نام زندگی ہے۔ جب نفسانی خواہشات غالب آ جاتی ہیں تو انسان تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ جب روحانی قوتیں غالب آ جاتی ہیں تو انسان واصل با اللّٰہ ہو کر زندگی کی جنگ جیت لیتا ہے۔

جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام دینِ فطرت ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے اندر انسانی جسم اور روح دونوں کی ضروریات اور تقاضات کو پورا کرنے کی صلاحیت ہے، برعکس ہندو، بدھ اور عسیائی مذہب کے کہ جن میں گوشہ نشینی کے ذریعے روح کی پرورش کے لئے جسم کو بھوکوں مارا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ جسم کی مثال گھوڑے کی طرح ہے اور روح بمنزلہ سوار ہے۔ گھوڑے کو بھوکا مار کر آدمی کس طرح منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے؟ اسلام اس لئے دین فطرت ہے کہ اس میں روح اور جسم (سوار اور سواری) دونوں کی پرورش کا انتظام موجود ہے۔ اسلام میں نہ گھوڑے کو اتنا موٹا ہونے دیا جاتا ہے کہ سوار کو لے کر بھاگ جائے اور تباہ کر دے، نہ سوار کو اتنا کمزور کیا جاتا ہے کہ گھوڑے کو قابو میں نہ رکھ سکے۔ سواری اور سوار کے درمیان توازن کا نام اسلام ہے اور یہی صراط مستقیم ہے جس پر گامزن ہو کر انسان منزل مقصود یعنی قرب حق میں پہنچ جاتا ہے۔

انسانی فطرت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح جسم کو خوراک کی ضرورت ہے اور

خوراک کے بغیر لاغر ہو کر مر جاتا ہے اسی طرح روح کو بھی خوراک کی ضرورت ہے۔ جسم مادی ہے اس لئے خوراک بھی مادی ہے اور روح نور ہے اس کی خوراک بھی نورانی یعنی حق تعالیٰ کی محبت اور قرب اور معرفت ہے۔ جسم غذا نہ ملنے سے بے قرار ہو جاتا ہے، چنانچہ آج کل دنیا میں خاص طور پر مغربی دنیا میں مال و دولت کے انبار کے باوجود جو بے چینی لاحق ہے اس کی وجہ یہی ہے اور صرف یہی ہے کہ جہاں جسم کو خوارک پہنچانے کی خاطر زمین و آسمان کے قلابے ملائے جا رہے ہیں، روح کو غذا بہم پہنچانے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا جا رہا۔

انسانی فطرت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح جسم کے پانچ یا چھ حواس ہیں جن کے ذریعے اس ظاہری دنیا کی اشیا کا ہمیں شعور حاصل ہوتا ہے، اسی طرح انسانی روح کے بھی چھ حواس ہیں جن کو تصوف کی اصطلاح میں لطائف ستہ کہا جاتا ہے اور جن کے ذریعے باطنی دنیا کا ہمیں شعور حاصل ہوتا ہے۔ یہ لطائف جسم کے اندر مندرجہ ذیل مقامات پر ہیں:

۱۔ لطیفۂ نفس　اس کا مقام زیر ناف ہے اور اس کے نور کا رنگ زرد ہے۔
۲۔ لطیفۂ قلب:　اس کا مقام بائیں چھاتی ہے اور اس کے نور کا رنگ سرخ ہے۔
۳۔ لطیفۂ روح:　اس کا مقام دائیں چھاتی ہے اور اس کے نور کا رنگ سفید ہے۔
۴۔ لطیفۂ سر:　اس کا مقام وسط چھاتی ہے اور اس کے نور کا رنگ سبز ہے۔
۵۔ لطیفۂ خفی:　اس کا مقام وسط پیشانی ہے اور اس کے نور کا رنگ نیلگوں ہے۔
۶۔ لطیفۂ اخفیٰ:　اس کا مقام سر کی چوٹی ہے اور اس کے نور کا رنگ سیاہ ہے۔

جب ذکر الٰہی اور مراقبات کی مختلف مشقوں کے ذریعے ان روحانی حواس کو زندہ کیا جاتا ہے تو جس طرح ہم کو جسمانی حواس کے ذریعے مادی دنیا کا شعور حاصل ہوتا ہے اسی طرح روحانی حواس کے ذریعے ہمیں روحانی یعنی باطنی دنیا کا شعور حاصل ہوتا ہے اور قرب حق کے منازل طے ہوتے ہیں۔ یاد رہے کہ ایمان کے تین مدراج ہیں: علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ جب ہم قرآن میں پڑھتے ہیں کہ حق تعالیٰ موجود ہے تو یہ خبر پا کر ہم کو ذاتِ حق کے متعلق علم الیقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن جب عبادات و ریاضات کے ذریعے ہم تزکیۂ نفس حاصل کرتے ہیں تو لطائف ستہ زندہ ہو جاتے ہیں اور ذاتِ حق کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور ایمان کے اس درجہ کو عین الیقین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یقیناً علم الیقین سے عین الیقین کے درجہ کا ایمان زیادہ قوی ہوتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ قوی ایمان کا جو درجہ ہے اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ حق الیقین کا مرتبہ سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ امید ہے اس مثال سے مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ فرض کرو آپ نے آگ نہیں دیکھی اور کوئی شخص آپ کو آ کر کہتا ہے کہ آگ جلاتی ہے تو آگ کے متعلق آپ کا یہ یقین علم الیقین کہلائے گا۔ اگر کوئی شخص آپ کے سامنے آگ جلا دے تو آگ کے متعلق آپ کو عین الیقین کا درجہ حاصل ہوجائے گا۔ لیکن جب آپ اپنا ہاتھ آگ میں دے دیں تو آپ کو

حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ اسی طرح جب ہمیں خداوند تعالیٰ نے قرآن کے ذریعے اپنی ہستی کی خبر دی اور ہم نے یہ بات مان لی تو ہمارے ایمان کا درجہ علم الیقین ہو گا، لیکن جب عبادات و ریاضات کے ذریعے آپ کا تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے اور ذاتِ حق کا مشاہدہ ہوتا ہے تو ایمان لے آنا عین الیقین کہا جائے گا، یعنی آنکھوں سے دیکھ کر ایمان لے آنا اور جب قرب حق کی وہ منزل حاصل ہو گی جس کی خبر ہم کو قرآن نے آیہ مبارکہ ”نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ“ میں دی ہے تو ہیں ایمان کا وہ درجہ نصیب ہو گا جسے حق الیقین کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو خبر ملی تھی کہ حق تعالیٰ انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، وہ خبر اب خبر نہیں رہی بلکہ آپ اپنے اندر ذاتِ حق کو موجود محسوس کرتے ہیں۔ یہ ہے مقامِ حق الیقین۔

ان مقاماتِ قرب کو حاصل کرنے کے لئے نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کی پابندی ضروری ہے لیکن روحانی ترقی کی رفتار تیز کرنے کی خاطر قرآن حکیم اور حدیث نبویؐ میں جا بجا نوافل یعنی نفلی نماز، نفلی روزے اور نفلی زکوۃ یعنی مقررہ زکوۃ سے زیادہ راہ حق میں خیرات کرنے کی تاکید آئی ہے جس سے نفس کا زور کم ہوتا ہے اور روحانی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان قرب حق کی منازل طے کرتا ہے اور واصل باللّٰہ ہو جاتا ہے اور یہی انسانی زندگی کا مدعا اور مقصد ہے۔ تصوف کے متعلق جو یہ الزامات لگائے گئے کہ ہندو مت، بدھ مت، عیسائیت اور فلسفۂ یونان سے حاصل کیا گیا، یہ سرا سر لغو اور بے بنیاد ہیں جو دشمنانِ اسلام نے لگائے ہیں۔ بلکہ تاریخی شواہد سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ الٹا ہندو اور عیسائی اربابِ روحانیت نے اولیائے اسلام سے زبردست استفادہ اور اخذِ فیض کیا ہے۔

تصوف کے متعلق جن لوگوں نے اعتراضات کئے ہیں وہ تصوف کو باہر سے کھڑے ہو کر دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ اندر آ کر دیکھنے سے کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت پر حقیقی معنوں میں صوفیائے کرامؒ نے عمل کیا، نہ کہ علمائے ظواہر نے۔ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کا فرمان ہے ”لا یومن احد کم حتی یحب لا خیہ ما یحب لنفسہ“ (ترجمہ: تم میں کوئی مومن ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہے) اور آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپ نان جویں پر اس لئے اکتفا فرماتے تھے کہ ہر شخص کو سفید روٹی نہیں مل سکتی۔ چنانچہ صوفیائے کرامؒ نے اس سنت پر عمل کیا۔ آپ زمین پر سوتے تھے کیونکہ ہر شخص کو پلنگ حاصل نہ تھا۔ صوفیائے کرامؒ نے اس سنت پر بھی عمل کیا، لیکن علمائے ظواہر نے عیش و عشرت میں زندگیاں گزاریں۔ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم راتوں کو جاگتے اور نمازیں پڑھتے تھے۔ صوفیائے کرامؒ نے بھی اس سنت پر اس سختی سے عمل کیا کہ بعض حضرات نے تو پچاس پچاس برس تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔

رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کا گھر ایک جھونپڑی تھی جس کی نہ چھت تھی نہ دروازہ۔ صوفیاء کرامؒ نے آپ کی اس سنت پر بھی شد و مد سے عمل کیا اور علمائے ظواہر محلات میں عیش کرتے رہے۔ رسول اکرم صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے شدید عبادات، ریاضات اور مجاہدات کیے، صوفیائے کرامؒ نے

بھی شدید مجاہدات کئے اور حق تعالیٰ کے قرب و معرفت سے مالامال ہوئے۔ ان حضرات کے مشاہدات اور کشف و کرامات سے کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن علمائے ظواہر جنھوں صرف پانچ وقت نماز پر اکتفا کیا ان بلند مقاماتِ قرب سے محروم رہے اور اس محرومی پر آنسو بہانے کی بجائے الٹا صوفیائے کرامؒ کی عبادات، ریاضات، اور مجاہدات کا مذاق کا اڑاتے رہے حالانکہ صوفیاءؒ کے مجاہدات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مجاہدات کے مطابق تھے۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ علماء ظواہر اور یورپ کے مستشرقین کا یہ الزام بھی پوری طرح صحیح نہیں ہے کہ لفظ تصوف رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں مروج نہیں تھا کیونکہ حضرت مخدوم سید علی ہجویری رحمت اللہ علیہ نے کشف المحجوب کے تیسرے باب میں کے شروع میں یہ حدیث نقل کی ہے: "من سمع صوت اھل التصوف فلا یومن علی دعائھم کتب عند اللہ من الغافلین" (ترجمہ: جس نے اہل تصوف کے آواز سنی اور ان کی پکار پر ایمان نہ لایا، اللہ تعالیٰ کے ہاں غافلوں میں لکھا جاتا ہے)۔ نیز لفظ طریقت خود قرآن کی اس آیت میں موجود ہے: "وَّاَنۡ لَّوِ اسۡتَقَامُوۡا عَلَى الطَّرِيۡقَةِ لَاَسۡقَيۡنٰهُمۡ مَّآءً غَدَقًا" یعنی اگر وہ طریقت پر قائم رہے تو ہم ان کو خاص پانی "روحانیت" سے سیراب کر دیں گے۔ نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے: "الفقر فخری (فقر میرا فخر ہے)"۔ فقر کیا ہے؟ تصوف ہی تو ہے۔ نیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے: "الفقر وطن غیب (فقر عالم غیب کا وطن ہے)"۔

علاوہ ازیں یاد رہے کہ تصوف مشتمل ہے چار ارکان پر: شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت ایک راستہ ہے، راستے پر چلنے کا نام طریقت ہے، اس راہ پر چل کر جس منزل مقصود پر رسائی ہوتی ہے اس کا نام حقیقت ہے اور منزلِ مقصود پر جو اسرار و رموز بتائے جاتے ہیں ان کا نام معرفت ہے۔ اس حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے تصوف کے چار ارکان کا ذکر فرمایا ہے: "الشریعتہ اقوالی، والطریقتہ افعالی، والحقیقت احوالی، والمعرفتہ سری" (ترجمہ: شریعت میرے اقوال کا نام ہے، طریقت میرے اعمال کا نام ہے، حقیقت میرے باطنی احوال ہیں اور معرفت میرا راز ہے)۔

یہ حدیث سخت گیر علمائے دیوبند نے شرح مثنوی مولانا روم رحمت اللہ علیہ میں نقل کی ہے جو ان کے شیخ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمت اللہ علیہ کی شرح ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح نہ ہوتی تو علمائے دیوبند ہرگز اس کو نقل نہ کرتے۔ نیز حضرت امام مالکؒ جو صحابی نہیں ہیں بلکہ تابعی ہیں اور جو ساری عمر مدینہ منورہ میں رہے، ان کا مندرجہ ذیل قول بھی ظاہر کرتا ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کے زمانے میں بھی لفظ تصوف مروج تھا۔ آپ فرماتے ہیں "من تصوف ولا تفقھہ تذ ندق من تفقھہ ولا تصوف تفسق من جمع بینھما تحقق" (ترجمہ: جس نے تصوف سیکھا لیکن فقہ نہ سیکھا گمراہ ہے، جس نے فقہ سیکھا لیکن تصوف نہ سیکھا فاسق ہوا، جس نے دونوں کو جمع کیا حقیقت کو پہنچا)۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ جس شد و مد، جوش و خروش اور ذوق و شوق سے اہل تصوف نے شریعت پر عمل کیا ہے اس کا عشر عشیر بھی علمائے ظواہر نہیں کر سکے۔ حضرت جنید بغدادی رحمت اللہ علیہ کے پاس ایک رات باہر سے کھانا آیا۔ چونکہ کھانا بھیجنے والا سرکاری ملازم تھا، آپ نے کھانا نہ کھایا (اس خیال

سے کہ سرکاری خزانے کا مال مخدوش ہوتا ہے) اور نہ ہی آپ نے وہ کھانا کسی اور کو کھانے دیا بلکہ دریا میں پھینک دیا اور اس روز سے اس دریا کی مچھلی کھانا ترک کر دی کہ مکمن ہے اس مچھلی نے وہی چیز کھائی ہو۔ یہ ہے صوفیاء کرامؒ کا تقویٰ اور پابندئ شریعت جس کی گرد کو بھی علمائے ظواہر نہیں پہنچ سکے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمت اللہ علیہ نے ساری عمر خربوزہ نہ کھایا کیونکہ ان کو کسی حدیث سے یہ معلوم نہ ہوا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خربوزہ کس طرح کاٹا اور کس طرح کھایا اور ممکن ہے کسی اور طرح کاٹ کر کھانے سے سنتِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا خلاف ہو۔ صوفیاء کرامؒ کی شریعت پر شدید پابندی کی داستانوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں اور پھر بھی یار لوگ الزام لگاتے ہیں کہ تصوف کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں! حالانکہ تصوف عین شریعت ہے اور اسلام کی روح رواں ہے۔ روح کو اسلام سے خارج کر دیا جائے تو وہ ایک مردہ ڈھانچہ بن کر رہ جاتا ہے جسیے آج کل علمائے ظواہر نے بنا رکھا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ساری زندگی روحانیت سے لبریز تھی۔ آپ کے معجزات، آپ کی وحی، آپ کا تعلق بااللہ اور حق تعالیٰ کے ساتھ شدید محبت، قرب و معرفت اور آپ کا معراج، یہ تمام بھرپور روحانیت کے دلائل اور تصوف کی جان ہیں۔ آپ فرماتے ہیں "میں پیچھے کی طرف بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح آگے کی طرف"۔ آپ فرماتے ہیں "مومن کی فراست (یعنی باطنی بصیرت) سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ آپ فرماتے ہیں "جب بندہ قربِ حق میں پہنچتا ہے تو اللہ کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اللہ کے کانوں سے سنتا ہے اور ہر کام اللہ کی طاقت سے کرتا ہے"۔ آپ فرماتے ہیں "انسان کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے"۔ آپ فرماتے ہیں "نماز مومن کی معراج ہے"۔ تصوف سے مراد یہی روحانی زندگی، روحانی عروج اور روحانی قرب و معرفت الٰہی ہے۔ دعا ہے کہ ہم سب کو حق تعالیٰ یہی مقامات و مراتب قرب و معرفت عطا فرمائیں۔ آمین۔ وباللّٰہ التوفیق۔

## سلوک الی اللہ کا خاکہ

جن منازل یعنی فنا فی اللّٰہ، بقا بااللّٰہ وغیرہ کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کا ایک نقشہ درج ہے جس سے سالک راہ طریقت کے عروجی اور نزولی سفر کا کچھ اندازہ لگایا جا سکے گا۔ سالک نقطہ (ب) سے روحانی سفر کی ابتدا کرتا ہے اور جب نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اوراد، اذکار، مشاغل اور مراقبات کے ذریعے اس کا

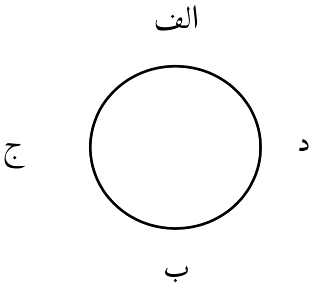

تزکیۂ نفس ہو جاتا ہے تو وہ نقطہ (ج) کے راستے سے نقطہ (الف) کی طرف پرواز کرتا ہے۔ جب مقام (الف) تک پہنچتا ہے تو فنا فی اللہ کا آغاز ہوتا ہے۔ ب سے ج اور الف تک کے سفر کو ”سیر الی اللہ“ یا ”عروجی سفر“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اب چونکہ ذاتِ حق کی کوئی انتہا نہیں، اس لئے سیر فی اللہ کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ سالک چاہے تو ساری عمر بلکہ ہزاروں، لاکھوں برس ذات حق میں سفر کرے، سفر کی انتہا نہیں ہوتی، بلکہ جس خوش نصیب کی ذات حق میں سیر شروع ہو جاتی ہے تو موت کے بعد قیامت تک اور قیامت کے بعد بہشت میں بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سیر فی اللہ میں منہمک رہتا ہے۔

## بقا باللہ

لیکن جہاں دیگر مذاہب میں آخری مقام فنا فی اللہ تھا اور ہندو، بدھ، عیسائی راہب ترک دنیا کر کے غاروں اور جنگلوں میں رہ جاتے تھے، اسلام نے آ کر مقامِ بقا باللہ کی راہنمائی کی۔ بقاباللہ سے مراد ہے مقامِ فنا کی محویت، مستی اور استغراق سے نکل کر ہوش میں آنا اور فرائض زندگی ادا کرنا۔ لیکن چونکہ مقامِ فنا فی اللہ میں سالک بمصداق حدیث ”بی یبصرو وبی بسمع“ صفات الٰہی سے متصف ہو جاتا ہے، اس لئے مقامِ بقاباللہ پر پہنچ کر اس کے سر پر تاجِ خلافتِ الٰہیہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں مقامِ فنا پر سراسر سکر، محویت، استغراق اور لاشعوری ہے، مقامِ بقا پر صحو، ہوشیاری اور شعور ہے۔ اس لئے مقامِ فنا کے سالک کو ”مغلوب الحال“ اور مقامِ بقا کے سالک کو ”غالب الحال“ کہا جاتا ہے۔ نیز مقامِ فنا کے سالک کو ”ابن الحال“ اور بقا کے سالک کو ”ابو الحال“ بھی کہا جاتا ہے۔ مقامِ بقا کا دوسرا نام ”نزول“ اور ”عبدیت“ یا ”عبودیت“ ہے جہاں پہنچ کر سالک پہلے سے زیادہ ذوق و شوق، خشوع و خضوع اور عجز و نیاز سے عبادت کرتا ہے۔ اس وجہ سے کہ اس کو ذاتِ حق کی عظمت کا پہلے سے زیادہ علم ہو جاتا ہے۔

اب ہم مندرجہ بالا نقشہ کی طرف آتے ہیں۔ جب سالک اپنی جبلی فطرتی استعداد اور صلاحیت کے مطابق فنا فی اللہ کے ذریعے قرب حق کی بلند سے بلند منزل پر پہنچ جاتا ہے تو پھر اس کو اپنی خودی کی طرف لوٹ کر مقامِ بقا باللہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ نزول اور واپسی کا یہ سفر نقطہ (الف) سے شروع ہو کر نقطہ (د) کے ذریعے نقطہ (ب) پر ختم ہوتا ہے۔ یعنی جہاں سے سفر شروع کیا تھا پھر وہاں واپس آنا پڑتا ہے۔ اس لئے حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ ”النھایتہ رجوع الی بدایہ“ (ترجمہ: آخری مقام کیا ہے، مقام ابتدا پر واپس آنا)۔ لیکن بقاباللہ کا مطلب یہ نہیں کہ اب وہ فنا فی اللہ نہیں ہے بلکہ وہ بیک وقت فانی فی اللہ بھی ہوتا ہے اور باقی باللہ بھی۔ یعنی وہ بیک وقت قرب و وصال کے مزے بھی لیتا ہے اور ہجر و فراق کی آگ میں بھی جلتا رہتا ہے۔ اس مقام کو جامعیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یعنی بیک وقت فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہونا۔ یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے، دیگر مذاہب کی یہاں تک رسائی ممکن نہیں تھی اور اب جبکہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعثت پر تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں، دیگر مذاہب کی مقامِ فنا تک بھی رسائی ختم ہو چکی ہے۔ لہذا اب جو کچھ ان کو حاصل ہوتا ہے، ریاضت اور مجاہدات کے ذریعے قدرے استدراج یعنی معمولی قسم کے فوق العادت امور ہیں جن کو اسلام میں زیادہ وقعت نہیں دی جاتی

کیونکہ کشف و کرامات سے روحانی ترقی میں رکاوٹ آ جاتی ہے۔ حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ فرمایا کرتے تھے "کاش میں عہدِ شباب میں کشف و کرامات سے پرہیز کرتا تو مجھے اس سے بھی زیادہ ترقی ہوتی"۔

**حوالہ: شرح کشف المحجوب از حضرت واحد بخش سیال چشتی صابری رحمت اللہ علیہ۔**

**دکھ کی بات تو یہ ہے کہ آجکل تصوف کے نام پر نام نہاد عامل حضرات دوکانداری میں مصروف ہیں جو بین السلاسل تعلقات میں رخنہ پیدا کر رہے ہیں۔ تاریخ تصوف کو دیکھیے تو ہر جگہ مشائخ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ آجکل کے یہ دوکاندار اپنے مریدوں کو دوسرے مشائخ سے دور رہنے کا سبق دیتے ہیں۔ دوسرے سلاسل کی محافل سے خود بھی دور رہتے ہیں اور انہیں بھی دور رکھتے ہیں۔ ہاں اگر مرید کے کسی خاص مقام پر پہنچنے تک روکا جا رہا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر یہ تو طے ہے کہ ان دوکانداروں نے کثرتِ ازکار و اوراد کو ہی تصوف سمجھ رکھا ہے اور تربیت کی منازل سے ناواقف ہیں۔**

**آجکل ایک اور بات بہت زیادہ سننے میں آ رہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جہاں تمام سلاسل ختم ہوتے ہیں وہاں سے ان کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ایسا یا تو غلط فہمی کی وجہ سے ہے یا دوکانداری کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سفر کبھی ختم ہی نہیں ہوتا۔ کسی سلسلے کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ حضرت واحد بخش سیال صاحبؒ کے دئیے گئے نقشے کو غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تو ایک دائرہ ہے جس میں سالک، شیخ بن جانے کے بعد بھی، عالمِ حیرانی سے عالمِ ویرانی کی طرف اور پھر عالمِ ویرانی سے عالمِ حیرانی کی طرف پرواز کرتا رہتا ہے۔**

**ہاں یہ ضرور ہے کی اپنے حق میں اپنے شیخ کو سب سے افضل سمجھنا مرید کے فرائض میں شامل ہے، مگر اس سے کسی اور سلسلے یا شیخ کو نیچا کرنا یا اس کی تحقیر کرنا تصوف میں ارتداد کی مانند ہے۔**

# حدیثِ دل

آجکل تصوّف ایک نام ہے بِلا حقیقت جبکہ پہلے یہ حقیقت تھی بغیر نام کے۔

حضرت ابوالحسن ابو شنجہ رحمت اللہ علیہ

# انعامِ شکست

جنید خلیفہ بغداد کے درباری پہلوان، مملکت کی ناک کے بال تھے۔ وقت کے بڑے بڑے سورما ان کی طاقت اور فن کا لوہا مانتے تھے۔ ڈیل ڈول اور قد و قامت کے لحاظ سے بھی وہ دیکھنے والوں کے لئے ایک تماشا تھے۔ شخصیت کے رعب و دبدبے کا یہ حال تھا کہ وقت کا بڑے سے بڑا جیوٹ بھی نظر ملانے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ کمال فن کی غیر معمولی شہرت نقطۂ انتہا پر پہنچ گئی تھی۔ ساری مملکت میں جنید کا کوئی مقابل و حریف نہیں رہ گیا تھا۔ اب جنید کا مصرف سوا اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ وہ خلیفہ بغداد کی شاہانہ سطوت کے ایک واضح نشان تھے۔ دربارِ شاہی میں جنید کے لئے اعزاز کی ایک جگہ مخصوص تھی جہاں وہ بن سنور کر کلغی لگائے خلیفہ کی دائیں جانب بیٹھا کرتے تھے۔

دربار لگا ہوا تھا۔ اراکینِ سلطنت اپنی اپنی کرسیوں پر فروکش تھے۔ جنید بھی اپنے مخصوص لباس میں زینت دربار تھے کہ ایک چوبدار نے آکر اطلاع دی۔ صحن کے دروازے پر ایک لاغر و نیم جان شخص کھڑا ہے۔ صورت شکل کی پراگندگی اور لباس و پیراہن کی شکستگی سے وہ ایک فقیر معلوم ہوتا ہے۔ ضعف و نقاہت سے قدم ڈگمگاتے ہیں۔ زمین پر کھڑا رہنا مشکل ہے لیکن اس کی آواز کے تیور اور پیشانی کی شکن سے فاتحانہ کردار کی شان ٹپکتی ہے۔ آج صبح سے وہ اصرار کر رہا ہے کہ میرا چیلنج جنید تک پہنچا دو میں اس سے کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔ قلعہ کے پاسبان ہر چند اسے سمجھاتے ہیں کہ چھوٹا منہ بڑی بات مت کرو۔ جس کی ایک پھونک سے تم اُڑ سکتے ہو اس سے کشتی لڑنے کا خواب پاگل پن ہے لیکن وہ بضد ہے کہ اس کا پیغام دربارِ شاہی تک پہنچا دیا جائے۔

چوبدار کی زبانی یہ عجیب وغریب خبر سن کر اہلِ دربار کو اس آنے والے اجنبی شخص سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ خلیفہ نے حکم دیا اسے حاضر کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد چوبدار اسے اپنے ہمراہ لئے ہوئے حاضر ہوا۔ اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ چہرے پر ہوائی اڑ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ دربار میں آ کر کھڑا ہوا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ وزیر نے دریافت کیا۔ جنید سے کشتی لڑنا چاہتا ہوں۔ اجنبی نے جواب دیا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ جنید کا نام سن کر بڑے بڑے زور آوروں کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا ہے۔ ساری ریاست میں اب انکا کوئی مد مقابل نہیں رہ گیاہے۔ ایسی مضحکہ خیز بات کے لئے اصرار مت کر جو دماغی جنون میں مہتم کرنے کے علاوہ تمہارے لئے باعث ہلاکت بھی ہو سکتی ہے۔ وزیر نے فہمائش کے انداز میں کہا۔ جنید کی شہرت ہی مجھے یہاں کھینچ کر لائی ہے۔ اسی اعتقاد موہوم کی میں تردید کرنا چاہتا ہوں کہ ساری ریاست میں جنید کا کوئی مد مقابل نہیں رہ گیا۔ قد و قامت کو شکوہ اور بازؤں کا کس بل ہی فتح و شکست کا معیار نہیں رہ گیا ہے۔ فن کی ذہانت بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہے۔ اطمینان رکھئیے! میرا دماغی توازن اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ سود و زیاں سمجھانے کے لئے مجھے ناصح کی ضرورت نہیں ہے۔ انجام کا سارا نقشہ میری نظر کے سامنے ہے۔ اب بحث میں وقت ضائع کرنے کی بجائے مجھے اثبات و نفی میں جواب

دیا جائے۔ اجنبی شخص نے فاتحانہ تیور کے ساتھ جواب دیا۔

اجنبی شخص کی جرأتِ گفتار پر سارا دربار دم بخود ہو کر رہ گیا۔ آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ یہ شخص دماغی جنون میں مہتم کئے جانے کے قابل ہے۔ دانشوروں کی طرح کا اندازِ گفتگو یقیناً پراسرار شخصیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ ظاہری بے مائیگی کے ساتھ کشور کشاد بہادروں جیسے کردار کے ہو نہ ہو کوئی مہارت فن کا عجیب و غریب کرشمہ ہے۔

جنید بھی اجنبی شخص کو حیرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ہزار تجسس کے بعد بھی اسکے سراپا میں فنی مہارت کی کوئی علامت نہیں مل رہی تھی۔ سخت حیران تھے کہ آخر کس چیز نے اسے اتنا جری بنا دیا ہے۔ مسئلہ بہت پیچیدہ بن گیا تھا۔ اس لئے خلیفۃ المسلمین کے اشارے پر وزیر نے اہل دربار کی رائے دریافت کی۔

سارا نشیب و فراز سمجھانے کے بعد بھی اگر یہ بضد ہے تو اس کا چیلنج منظور کر لیا جائے۔ انجام کا یہ خود ذمہ دار ہے۔ مقابلے میں شکست کھا گیا تو یہ توقع کے عین مطابق ہو گی اور اگر فتح یاب ہو گیا تو ایک پراسرار شخصیت کے جوہرِ کمال سے پہلی بار دنیا کو روشناس کرانے کا فخر ہمیں حاصل ہو گا۔ اہل دربار نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تھوڑی دیر تک بحث و تمحیص کے بعد بالآخر یہ بات طے پا گئی کہ اس کے چیلنج کو قبول کر لیا جائے۔ خلیفۂ وقت نے بھی قرارداد پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ کُشتی کے مقابلے کے لئے دربارِ شاہی سے تاریخ اور جگہ متعین کر دی گئی۔ محکمۂ نشر و اشاعت کے اہلکاروں کو حکم صادر ہوا کہ ساری مملکت میں اس کا اعلان کر دیا جائے۔

اطمینان رکھا جائے میں وقت مقررہ پر دنگل میں حاضر ہو جاؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے اجنبی شخص دربار سے رخصت ہو گیا۔ اپنے زمانے میں جنید کا کوئی مد مقابل نہیں، یہ یقین لوگوں کے دلوں میں اس طرح گھر کر چکا تھا کہ مقابلے کا جس نے بھی سنا دم بخود رہ گیا۔

ساری مملکت میں ہونے والے دنگل کا تہلکہ مچا ہوا تھا۔ شاہراہوں پر بازاروں میں ہر جگہ یہی تذکرہ موضوع سخن بن گیا تھا۔ ہر شخص اس اجنبی مسافر کو دیکھنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں لوگوں میں گشت کر رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ دیوانوں کے بھیس میں وہ ایک نہایت شاطر آدمی تھا جو اپنی چرب زبانی سے سب کو بے وقوف بنا گیا۔ اب وہ ہرگز پلٹ کر نہیں آسکتا۔ اپنی ہلاکت کو کبھی دعوت نہیں دے گا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دربارِ خلافت کا ایک امیر پاگل آدمی کی جنون انگیز حرکتوں کا شکار ہو گیا۔ عقل کی سلامتی کے ساتھ اس طرح کا اقدام ناممکن ہے۔ اکثر لوگوں کی رائے تھی کہ وہ ضرور آئے گا۔ اسے شاطر اور پاگل سمجھنا غلط ہے۔ وہ فنی مہارت میں ایک پراسرار شخصیت کا مالک ہے۔ کسی پاگل کا دماغ اتنی گہرائی میں اتر کر نہیں سوچ سکتا۔ اس کے سراپا کی جن لوگوں نے تصویر کھینچی ہے وہ نہایت پر کشش اور والہانہ ہے۔ کسی شاطر آدمی کی شخصیت میں اس طرح کی روحانی جاذبیت نہیں ہوا کرتی۔

بہر حال ہوا کچھ ایسی چل گئی تھی کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ تاریخ جیسے جیسے قریب آتی جا رہی

تھی انتظار شوق کی آنچ تیز ہوتی جاتی تھی۔ سب سے زیادہ اچنبھا لوگوں کو اس بات کا تھا کہ مقابلہ پہاڑ اور تنکے کے درمیان تھا۔ برس ہا برس کے بعد جنید کے کسی مقابل سے لوگوں کے کان آشنا ہوئے تھے۔ شور و ہنگامہ سے فضا اتنی بوجھل ہوگئی تھی کہ جنید بھی عالم تحیر میں کھوئے سے رہنے لگے تھے۔ بڑی تیزی کے ساتھ اپنے اندر سے کوئی چیز انہیں بدلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دن بہ دن شاہی دربار سے دل کا تعلق ٹوٹتا جا رہا تھا۔ اپنی کیفیت انہیں خود سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ چہرے کا رنگ اڑا اڑا دیکھ کر دربار کے قریبی حلقوں میں یہ چرچا عام ہو گیا تھا کہ اس بار مقابلہ اتنا پراسرار ہے کہ پہلے ہی سے جنید پر ایک نا معلوم ہیبت طاری ہو گئی ہے۔

اب مقابلے کی تاریخ قریب آ گئی۔ دور دراز ملکوں سے سیاحوں اور تماشائیوں کے قافلے بغداد میں اترنا شروع ہو گئے تھے۔ مملکت کی آبادیوں سے اونٹوں کی قطاروں کا سلسلہ ٹوٹتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی انسانوں کا انبوہ سیلاب کی طرح امنڈتا ہوا دکھائی پڑتا تھا۔

اب وہ شام آ گئی تھی جس کی صبح تاریخ کا ایک اہم فیصلہ ہونے والا تھا۔ آفتاب ڈوبتے ڈوبتے کئی لاکھ آدمیوں کا ہجوم بغداد میں ہر طرف منڈلا رہا تھا۔ جنید کے لئے آج کی رات بہت پراسرار ہو گئی تھی۔ ساری رات بے چینی میں کروٹیں بدلتے گزری۔ اپنے زمانے کا مانا ہوا سورما آج نامعلوم طور پر دل کے ہاتھوں ڈوبتا جا رہا تھا۔ جس نے بڑے بڑے زور آوروں کا غرور پلک جھپکتے خاک میں ملا دیا تھا۔ دربارِ شاہی کے ناموس کے علاوہ اپنی عالم گیر شہرت کا سوال بار بار سامنے آ رہا تھا۔ اس اجنبی شخص کے متعلق رہ رہ کر دل میں یہ خلش پیدا ہو رہی تھی کہ اس کے فاتحانہ تیور کے پیچھے کوئی نہ کوئی طاقت ضرور ہے۔ دل کے یقین کے آگے جسم کی توانائی کوئی چیز نہیں۔ معنوی کمالات اور نادیدہ قوتوں کا کوئی مخفی جوہر ضرور اس کی پشت پناہی میں ہے ورنہ کسی دست و بے مایہ انسان میں یہ جرأتِ کردار کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ انہی پریشان خیالات کے ادھیڑ بن میں ساری رات گزر گئی اور بغداد کی پہاڑیوں پر سحر کا اجالا پھیل گیا۔ صبح ہوتے ہی شہر کے سب سے وسیع میدان میں نمایاں جگہوں پر قبضہ کرنے کے لئے تماشائیوں کا ہجوم آہستہ آہستہ جمع ہونے لگا۔

بغداد کا سب سے وسیع میدان لاکھوں تماشائیوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ اکھاڑے کے حاشیے پر چاروں طرف نہایت قرینے سے کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ یہ شاہی خاندان، درباری معززین اور مملکت کے عمائدین کی نشست گاہ تھی۔ تمام آنے والے اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ بادشاہ کی سواری آ رہی تھی۔ درباری خدام سروں پر کلغیاں لگائے کمر میں پٹکا باندھے راستہ صاف کرنے میں مصروف ہو گئے۔ خدام و حشم کے ساتھ حضرت جنید بھی بادشاہ کے ہمراہ تشریف لائے۔ سب آچکے تھے۔ اب اس اجنبی شخص کا انتظار تھا جس نے چیلنج دے کر سارے علاقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

حضرت جنید کے طرف دار فاتحانہ خوشی کے جذبے میں مجمع کو یقین دلا رہے تھے کہ اس کا انتظار بے سود ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔ جنید سے نبرد آزما ہونا آسان نہیں ہے۔ جنید کے تصور ہی سے بڑے بڑوں کا زہرہ پانی ہو جاتا ہے۔ ایک عام آدمی کی کیا بساط ہے کہ مقابلے کے لئے سامنے آسکے۔ بلا شبہ وہ پوری مملکت

کو فریب میں مبتلا کر گیا ہے اسے آنا ہوتا تو بہت پہلے میدان میں آجاتا۔

اس کی بات ابھی ختم نہ ہو پائی تھی کہ درباری حلقوں میں سے ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا: میں اعتراف کرتا ہوں کہ حکومت نہایت سادہ لوحی کے ساتھ ایک گہری سازش کا شکار ہو گئی ہے۔ یہ اقدام دانش مندی کے قطعی خلاف ہوا کہ محض ایک گمنام شخص کی بات پر مختلف ملکوں کے لاکھوں انسانوں کی بھیڑ جمع کر دی گئی۔ چکمہ دے کر نکل جانے والے اس راہ گیر کو اگر حکومت گرفتار بھی کرنا چاہے تو بغیر نام و نشان کے کیسے گرفتار کرے گی؟

اس میدان میں ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو غائبانہ طور پر اس اجنبی شخص کے حامی تھے۔ نامعلوم طور پر انکے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ موجودہ صورتحال سے ان کے چہروں پر افسردگی کا نشان واضح ہونے لگا۔ ناامیدی کے عالم میں بڑی ہمت کر کے ان میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا: ابھی وقت مقررہ میں کچھ وقفہ باقی رہ گیا ہے۔ اس لئے اجنبی شخص کے بارے میں کوئی آخری فیصلہ کرنا قبل از وقت ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی معقول عذر کی بنا پر تاخیر ہو گئی ہو۔ مقررہ وقت گزرجانے کے بعد وہ نہیں آیا تو یقیناً اسے قابلِ مذمت گردانا جائے گا۔

منٹ منٹ پر حضرت جنید کے حامیوں کا جوشِ مسرت بڑھتا جا رہاتھا اور وہ طرح طرح کی آوازیں کس کر مجمع کے ذہن سے اس اجنبی شخص کا اثر زائل کر رہے تھے۔ لیکن خود حضرت جنید پر ایک سکتے کی کیفیت طاری تھی۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں کھو گئے ہیں۔ لا شعوری طور پر وہ پیش آنے والے کسی حیرت انگیز واقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔ مجمع کا اضطراب اب قابو سے باہر ہونے لگا تھا۔ حضرت جنید کے حامیوں کی طرف سے بار بار یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ مسند خلافت سے کوئی فیصلہ کن اعلان کر کے مجمع کو منتشر کر دیا جائے۔ وقت مقررہ میں اب چند ہی لمحے باقی رہ گئے تھے کہ وزیر اعلان کرنے کھڑا ہوا۔ سارا مجمع گوش بر آواز ہو گیا۔ منہ سے پہلا لفظ ہی نکلا تھا کہ مجمع کے کنارے سے ایک شخص نے آواز دی: ذرا ٹھہر جائیے! وہ دیکھئے سامنے گرد اُڑ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے وہی اجنبی شخص ہو۔

اس آواز پر سارا مجمع گرداہ کی طرف دیکھنے لگا۔ آنے والے راہ گیر کے ہر قدم پر دلوں کا عالم زیر و زبر ہو رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر فضاؤں میں اڑتا ہوا غبار لاکھوں امیدوں کا مرکزِ نگاہ بن گیا تھا۔ چند ہی لمحے کے بعد جب گرد صاف ہوئی تو دیکھا گیا کہ ایک نحیف و لاغر انسان پسینے میں شرابور ہانپتے ہانپتے چلا آرہا ہے۔ مجمع سے قریب ہونے کے بعد آثار و قرائن سے لوگوں نے پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جسکا انتظار ہو رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہی سارے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سارا مجمع اسکو دیکھنے کے لئے دوڑ پڑا۔ بڑی مشکلوں سے ہجوم پر قابو حاصل کر کے اسے میدان تک پہنچایا گیا۔ ظاہری شکل و صورت دیکھ کر لوگوں کو سخت حیرت تھی کہ ضعف و ناتوانی سے زمین پر جس کے قدم سیدھے نہیں پڑتے وہ جنید جیسے کوہ پیکر پہلوان سے کیا مقابلہ کر سکتا ہے۔ حضرت جنید کے ہمنوا پوری طرح مطمئن تھے کہ ابھی چند منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ اپنے وقت کی ایک عظیم شخصیت کے ساتھ گستاخانہ جسارت

کی سزا کتنی عبرت ناک ہوتی ہے۔

دنگل کا وقت ہو چکا تھا۔ اعلان ہوتے ہی حضرت جنید تیار ہو کر اکھاڑے میں اتر گئے۔ وہ اجنبی شخص بھی کمر کس کر ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ لاکھوں تماشائیوں کے لئے بڑا ہی حیرت انگیز منظر تھا یہ۔ حضرت جنید کے سامنے وہ اجنبی شخص گرد راہ معلوم ہورہا تھا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سارا مجمع دونوں کی نقل و حرکت دیکھ رہا تھا۔

حضرت جنید نے خم ٹھونک کر زور آزمائی کے لئے پنجہ بڑھایا۔ اس اجنبی شخص نے دبی زبان سے کہا: کان قریب لائیے مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ نہ جانے اس آواز میں کیا سحر تھا کہ سنتے ہی حضرت جنید پر ایک سکتہ طاری ہو گیا۔ اچانک پھیلے ہوئے ہاتھ سمٹ گئے۔ کان قریب لاتے ہوئے کہا: فرمائیے۔ اجنبی شخص کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اتنی بات منہ سے نکل سکی: جنید میں کوئی پہلوان نہیں ہوں۔ زمانے کا ستایا ہوا ایک آلِ رسولؐ ہوں، سیدہ فاطمہؓ کا ایک چھوٹا سا کنبہ کئی ہفتوں سے جنگل میں پڑا ہوا فاقوں سے نیم جان ہے۔ سیدانیوں کے بدن پر کپڑے بھی سلامت نہیں ہیں کہ وہ گھنی جھاڑیوں سے باہر نکل سکیں، چھوٹے چھوٹے بچے بھوک کی شدت سے تڑپ رہے ہیں۔ ہر روز یہ کہہ کر شہر آتا ہوں کہ شام تک کوئی انتظام کر کے واپس لوٹوں گا لیکن خاندانی غیرت کسی کے آگے منہ نہیں کھولنے دیتی۔ گرتے پڑتے بڑی مشکل سے آج یہاں تک پہنچا ہوں۔ فاتح خیبر کا خونِ ہاشمی رگوں میں سوکھتا جا رہا ہے۔ چلنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ شرم سے بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ نہیں اٹھتے۔ میں نے تمہیں صرف اس امید پر چیلنج دیا تھا کہ آلِ رسولؐ کی جو عقیدت تمہارے دل میں ہے آج اس کی آبرو رکھ لو۔ وعدہ کرتا ہوں کہ کل میدانِ قیامت میں نانا جانؐ سے کہہ کر تمہارے سر پر فتح کی دستار بندھواؤں گا۔ فاطمی چمن کی مرجھائی ہوئی کلیوں کی اداسی اب دیکھی نہیں جاتی۔ جنید! عالم گیر شہرت و اعزاز کی صرف ایک قربانی سوکھے چہروں کی شادابی کے لئے کافی ہے۔ یقین رکھو آلِ رسولؐ کے خانہ بدوش قافلہ کی حرمت و آسودگی کے لئے تمہاری عزت و ناموس کا ایثار کبھی رائیگاں نہیں جائے گا۔ ہمارے خاندان کی یہ ریت تمہیں معلوم ہے کہ کسی کے احسان کا بدلہ زیادہ دیر تک ہم قرض نہیں رکھتے۔

اجنبی شخص کے یہ چند جملے نشتر کی طرح حضرت جنید کے جگر میں پیوست ہو گئے۔ پلکیں آنسوؤں کے طوفان سے بوجھل ہو گئیں۔ عشق و ایمان کا ساگر موجوں کے تلاطم کے زیر و زبر ہونے لگا۔ آج کونین کا سرمدی اعزاز سر چڑھ کر جنید کو آواز دے رہا تھا۔ عالمگیر شہرت کی پامالی کے دل کی پیشکش میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہوئی۔ بڑی مشکل سے حضرت جنید نے جذبات کی طغیانی پر قابو حاصل کرتے ہوئے کہا: کشور عقیدت کے تاجدار! میری عزت و ناموس کا اس سے بہترین مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے تمہارے قدموں کی اُڑتی ہوئی خاک پر نثار کر دوں۔ چمنستان قدس کی پژمردہ کلیوں کی شادابی کے لئے اگر میرے جگر کا خون کام آسکے تو اس کا آخری قطرہ بھی تمہارے نقشِ پا میں جذب کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اے خوش نصیب کہ کل میدانِ محشر میں سرکار صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اپنے نواسوں کے زر خرید غلاموں کی قطار میں کھڑے ہونے کی اجازت مجھے مرحمت فرمائیں۔

اتنا کہنے کے بعد حضرت جنید خم ٹھونک کر للکارتے ہوئے آگے بڑھے اور اجنبی شخص سے پنجہ ملا کر گتھ گئے۔ سچ مچ کشتی لڑنے کے انداز میں تھوڑی دیر پینترا بدلتے رہے۔ سارا مجمع نتیجے کے انتظار میں ساکت و خاموش نظر جمائے دیکھتا رہا۔ چند لمحوں بعد حضرت جنید نے بجلی کی تیزی کے ساتھ ایک داؤ چلایا۔ ہیبت سے دیکھنے والوں کی پلکیں جھک گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے حضرت جنید چاروں شانے چت تھے اور سینے پر سیدہ کا ایک نحیف و ناتواں شہزادہ فتح کا پرچم لہرا رہا تھا۔

حضرت جنید کی فاتحانہ زندگی کا نقشہ دیکھنے والی آنکھیں اس حیرت انگیز نظارے کی تاب نہ لا سکیں۔ ایک لمحے کے لئے سارے مجمع پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت کا طلسم ٹوٹتے ہی مجمع نے نحیف و ناتواں سید کو گود میں اٹھا لیا۔ میدان کا فاتح اب سروں سے گزر رہا تھا اور ہر طرف سے انعام و اکرام کی بارش ہو رہی تھی۔ تحسین و آفرین کے نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ شام تک فتح کا جلوس سارے شہر میں گشت کرتا رہا۔ رات ہونے سے پہلے پہلے ایک گمنام سید خلعت و انعامات کا بیش بہا ذخیرہ لے کر جنگل میں اپنی پناہ گاہ کی طرف لوٹ چکا تھا۔

حضرت جنید اکھاڑے میں اُسی شان سے چت لیٹے ہوئے تھے۔ اب کسی کو کوئی ہمدری انکی ذات سے نہیں رہ گئی تھی۔ ہر شخص انہیں پائے حقارت سے ٹھکرا تا اور ملامت کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ عمر بھر مدح و ستائش کا خراج وصول کرنے والا آج زہر میں بجھے ہوئے طعنوں اور توہین آمیز کلمات سے مسرور و شادکام ہو رہا تھا۔ ہجوم ختم ہونے کے بعد خود ہی اٹھے اور شاہراہ عام سے گزرتے ہوئے اپنے دولت خانے پر تشریف لے گئے۔ آج کی شکست کی ذلتوں کا سرور ان کی روح پر ایک خمار کی طرح چھا گیا۔ عمر بھر کی فاتحانہ مسرتیں وہ اپنی ننگی پیٹھ کے نشانات پر بکھیر آئے تھے۔

رات کی زلف سیاہ کمر کے نیچے ڈھل چکی تھی۔ بغداد کا سارا شہر تاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں محوِ خواب تھا۔ کہیں کہیں سے مشعل بردار پاسبانوں کی آوازیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت جنید جب اپنے بستر پر لیٹے تو بار بار کان میں یہ الفاظ گونج رہے تھے: وعدہ کرتا ہوں کہ کل میدان قیامت میں نانا جانؐ سے کہہ کر تمہارے سر پر فتح کی دستار بندھواؤں گا۔

کیا سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا میری قسمت کا ستارہ یک بیک اتنی بلندی پر پہنچ جائے گا کہ سرکار صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نورانی ہاتھوں کی برکتیں میری پیشانی کو چھو لیں۔ اپنی طرف دیکھتا ہوں تو کسی طرح اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل نہیں پاتا لیکن لاڈلوں کی "ہٹ" بھی تو کوئی چیز ہے۔ اگر میدان حشر میں شہزادے مچل گئے تو رحمتِ تمام کو کیونکر گوارا ہو سکے گا کہ انکے دل کے نازک آبگینے پر کوئی آنچ آ جائے۔ سارے زمانے میں آلِ رسولؐ کی زبان کا بھرم مشہور ہے۔ گردن کٹ سکتی ہے دی ہوئی زبان نہیں کٹ سکتی۔ آخر کربلا کے لالہ زار کی سرخی زبان ہی کے بھرم سے تو آج تک قائم ہے۔ نبی زادوں کا وعدہ غلط نہیں ہو سکتا۔ قیامت کے دن وہ ضرور اپنے نانا جانؐ تک میری بات پہنچائیں گے۔ اے کاش! آج ہی قیامت آ جاتی۔ آج ہی میدان حشر کا وہ روح پرور نظارہ نگاہوں کے سامنے ہوتا۔ آہ! اب جب تک زندہ رہوں گا قیامت کے لئے ایک ایک دن گننا پڑے گا۔ حساب و شمار کی گرفت میں آنے والی ایک طویل مدت

کیسے کٹے گی- یہ سوچتے حضرت جنید کی پر نم آنکھوں پر نیند کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور وہ خاکدان گیتی سے بہت دور ایک دوسری دنیا میں پہنچ گئے-

پہاڑوں صحراؤں اور آبادیوں کے سارے حجابات نظر کے سامنے سے اٹھ چکے تھے- اب بغداد سے گنبدِ خضراء کا کلس صاف دکھائی دے رہا تھا- جب تک آنکھ کھلی رہی نظر کا قافلہ بہاروں کے جلوہ شاداب سے سیراب ہوتا رہا- تھوڑی دیر کے بعد سنہری جالیوں سے ایک کرن پھوٹی اور مدینے کا آسمان روشنی سے معمور ہو گیا- پھر ایسا معلوم ہوا کہ نور کا ایک سفید بادل مدینے کے افق سے بغداد کی طرف بڑھتا آ رہا ہے- جہاں جہاں سے گزرا نور برستا گیا، فضا نکھرتی گئی، اندھیرا چھٹتا گیا، سحر پھیلتی گئی-

قریب آتے آتے اب رحمت و تجلی کا وہ روشن قافلہ بغداد کے آسمان پر جگمگا رہا تھا- چند ہی لمحے کے بعد وہ نیچے اترنا شروع ہوا- ایوانوں کے کنگرے جھک گئے، پہاڑوں کی چوٹیاں سرنگوں ہو گئیں، درختوں کی شاخیں سجدے میں گر پڑیں، بغداد کی زمین جھومنے لگی، بہاروں نے پھول برسائے، صبا نے خوشبو اڑائی، سحر نے اُجالا کیا، رحمتوں نے فرش بچھائے اور درخشاں کرنوں سے حضرت جنید کے صحن کا چپہ چپہ معمور ہو گیا- طلعت جمال سے آنکھیں خیرہ ہو گئیں- دل کیف وسرور میں ڈوب گیا- در و دیوار اور شجر و حجر کو زبان مل گئی اور الصلوۃ والسلام علیك یا رسول اللّٰہ کے نغموں سے فضا گونج اٹھی- عالم بے خودی میں حضرت جنید سلطان کونین صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم کے قدموں سے لپٹ گئے- سرکار صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے رحمتوں کے ہجوم میں مسکراتے ہوئے فرمایا: جنید اٹھو قیامت سے پہلے نصیبے کی سرفرازیوں کا نظارہ کر لو- نبی زادوں کی ناموس کے لئے شکست کی ذلتوں کا انعام قیامت تك قرض نہیں رکھا جائے گا- سر اٹھاؤ! تمہارے لئے فتح و کرامت کی دستار لے کر آیا ہوں- آج سے تمہیں عرفان و تقریب کی سب سے اونچی بساط پر فائز کیا گیا- تجلیات کی بارش میں اپنی ننگی پیٹھ کا غبار اور چہرے کے گرد کا نشان دھو ڈالو- اب تمہارے رخِ تاباں میں خاکدان گیتی ہی کے نہیں عالم قدس کے رہنے والے بھی اپنا منہ دیکھیں گے- بارگاہ یزدانی سے گروہ اولیا کی سروری کا اعزاز تمہیں مبارك ہو-

ان کلمات سے سرفراز فرمانے کے بعد سرکار مصطفیٰ صلی اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت جنید کو سینے سے لگا لیا- اس کی تفصیل نہیں معلوم اس عالم کیف بار میں اپنے شہزادوں کے جاں نثار پروانے کو کیا عطا فرمایا اس کی تفصیل نہیں معلوم ہو سکی- جاننے والے بس اتنا ہی جان سکے کہ صبح کو حضرت جنید کی آنکھ کھلی تو پیشانی کی موجوں میں نور کی کرن لہرا رہی تھی- آنکھوں سے عشق و عرفان کی شراب کے پیمانے چھلك رہے تھے- دل کی انجمن تجلیات کا گہوارہ بن چکی تھی- لبوں کی جنبش پر کارکنان قضا و قدر کے پہرے بٹھا دئیے گئے تھے- غیب و شہود کی ساری کائنات شفاف آئینے کی طرح تار نظر کی گرفت میں آ گئی تھی- نفس نفس میں عشق و یقین کی دہکتی ہوئی چنگاری پھوٹ رہی تھی- نظر نظر میں دلوں کی تسخیر کا سحر حلال انگڑائی لے رہا تھا-

کل کی شام جو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا تھا، آج صبح کو اس کی راہ گزر میں پلکیں بچھی جا رہی تھیں- کل جو شکست کی ذلتوں سے بوجھل ہو کر اکیلا اپنے گھر تك آیا، آج اس کے جلو میں کونین

کی امیدوں کے کارواں چل رہے تھے۔ ایک ہی رات میں سارا عالم زیر و زبر ہو گیا تھا۔ خواب کی بات بادِ صبا نے گھر گھر پہنچا دی تھی، طلوعِ سحر سے پہلے حضرت جنید کے دروازوں پر درویشوں کی بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ جونہی باہر تشریف لائے خراج عقیدت کے لئے ہزاروں گردنیں جھک گئیں۔ خلیفہ بغداد نے اپنے سر کا تاج اتار کر قدموں میں ڈال دیا۔ سارا شہر حیرت و پشیمانی کے عالم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ مسکراتے ہوئے ایک بار نظر اٹھائی اور ہیبت سے لرزتے ہوئے دلوں کو سکون بخش دیا۔ پاس ہی کسی گوشے سے آواز آئی: گروہ اولیاء کی سروری کا اعزاز مبارک ہو۔ منہ پھیر کر دیکھا تو نحیف و نزار آلِ رسول فرط خوشی سے مسکرا رہا تھا۔ ساری فضا سید الطائفہ کی مبارک باد سے گونج اٹھی۔

رضی اللّٰہ تعالیٰ عنھم وارضا ہم عنا

**حوالہ: زلف و زنجیر از علامہ ارشد القادری صاحبؒ۔**

# حدیثِ دل

صوفی وہ ہے جس کی ہمت اس کے خیال سے آگے نہ بڑھے (یعنی جو کام کرے حضور قلب کے ساتھ کرے)۔

تصوف خوش خلقی کا نام ہے۔

حضرت ابو محمد مرتعش رحمت اللّٰہ علیہ

تصوف یہ ہے کہ صاحب تصوّف ظاہر اور باطن میں اپنے آپ کو نہ دیکھے بلکہ حق کو دیکھے۔

حضرت علی بن بندار الصیرنی رحمت اللّٰہ علیہ